جلد ۸۹ | جون ۱۹۷۸ء | عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جون ۱۹۷۸ء مطابق رجب ۱۳۹۸ھ	جلد ۸۹

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ۴۱۱۰۱۶ ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بیس روپے۔ فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(۱)

رسالہ ترجمان القرآن جس کے کاغذی مدرسہ سے میں نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۷۸ء تک ایک ادنیٰ طالب علم کی مانند مسلسل سبق لیا ہے، اس کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ میں آہستہ آہستہ اُمیّت کے تاریک غار سے نکل آیا جس میں بے شمار ڈگریاں اور سندات رکھنے والے بھی ساری عمر گھرے رہتے ہیں۔ اس مدرسہ میں میرے اُستاذِ اعلیٰ اب تک مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی چلے آ رہے ہیں۔ آج میں اپنی موجودہ ایمانی و فکری سطح سے جو میرے بہت سے ہم مکتبوں سے فروتر ہے، اپنے سابق مقامِ تہی دامنی و فرومایگی سے ذرا جھک کر دیکھتا ہوں تو اس طرح کانپ جاتا ہوں جیسے کسی بلند مینار پر چڑھ کر کوئی شخص نیچے دیکھتا ہے تو ہول کھاتا ہے۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں اسی تاریک گڑھے میں رہ گیا ہوتا تو بڑے سے بڑا مالی مفاد، شاندار ترین دنیوی رتبہ، اسبابِ آسائش و آرائش کے انبار، ادبی یا سیاسی یا دینی دائرے میں مصنوعی طریقوں سے حاصل کردہ شہرتِ عام، ملکی اور بین الاسلامی اور بین الاقوامی سطحوں پر حاصل ہونے والا وقار، کوئی بھی چیز میری بدنصیبی کی تلافی نہ کر سکتی۔

ترجمان القرآن کو میری نگاہ میں ہمیشہ ایک ادب گاہ کی حیثیت حاصل رہی ہے کہ اس کی مجلس میں آدمی خاموشی سے داخل ہو اور کسی کونے میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کرے۔ ایسے مجلّہ کا قاری ہونا ہزار گونہ موجب سعادت ہے۔ مگر اس کی ادارت کی مسند پر بیٹھنے کا خیال آدمی کی تمام ایمانی و فکری کمزوریوں کو اس کے سامنے آراستہ کر دیتا ہے۔ یہ چھری کے بغیر ذبح (ذُبِحَ بغیرِ سکین) ہونے والی صورت ہے۔

۱۹۴۷ء میں صاحب ترجمان القرآن اور ان کے ساتھ علم و تقویٰ رکھنے والے دو رفقاء کی سیکورٹی ایکٹ

کے تحت نظر بندی نے ایک ایسی حالتِ اضطرار پیدا کر دی کہ صاحبِ ترجمان القرآن نے اپنی رائے یہ دی کہ ترجمان القرآن کو بند کر دیا جائے، پھر جب حالات سازگار ہوں گے تو ازسرِنو دیکھا جائے۔ مگر اپنے ان کے اہل الرائے حضرات جمع ہوئے اور انہوں نے مجھ میں اعتماد کو ابھار کر اس پر آمادہ کر لیا کہ اب اس سفینۂ علم کو اپنے قلم سے کھینے کی ذمہ داری مجھے لینی ہے۔ اور میں نے اس جذبے سے کہ اپنے محاذ پر کسی بھی خالی شدہ جگہ کو خالی رکھ کر کسی کو یہ احساس نہیں دلانا ہے کہ بس سارا کھیل دو چار افراد کا ہے۔ جن میں جسے بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے، کوئی نہ کوئی کام بند ہو جائے گا، اپنی استعداد سے زیادہ گراں ذمہ داری کے لیے اپنے کندھے پیش کر دیے۔ غالباً یہ سلسلہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رہائی (۱۹۵۰ء) تک جاری رہا۔ ہمت افزائی کرنے والے محبّوں نے میری اس دور کی مساعی کی قدر افزائی کی۔ خاص طور پر یہ امر میرے لیے بہت سرمایۂ تسکین ہوا کہ خود صاحب ترجمان القرآن نے میری خدمات کے لیے اچھے الفاظ استعمال کیے، اور الفاظ کے بغیر بھی میں مولانا کی نگاہوں اور ان کی پیشانی سے ان کے تاثرات پڑھ سکتا تھا۔

اس دورِ کار کی ایک خاص پیچیدگی یہ تھی کہ مجھے مرکز کی جملہ سرگرمیوں اور مشاورتوں میں بھی حصہ لینا ہوتا تھا، شہر لاہور کی جماعت کے اجلاسوں اور شہر میں ہونے والی دعوتی سرگرمیوں سے بھی پوری طرح دلچسپی رکھنی ہوتی تھی، پھر پاکستان بھر میں وقتاً فوقتاً دورے کر کے جلسوں میں تقاریر بھی کرنی ہوتی تھیں۔ اور لکھنے کا عالم یہ تھا کہ ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم کے اخبار میں صحافیانہ شذرے الگ لکھتا، اور ماہنامہ چراغِ راہ کو بہ حیثیت ادبی مجلے کے شروع سے آخر تک مرتب کرتا اور بہت سا حصہ خود لکھتا، نظم بھی اور نثر بھی، مقالات بھی اور کہانیاں بھی۔ اس سارے ہنگامے کے ساتھ ساتھ ترجمان القرآن کی ادارت اس طرح کرتا کہ جونہی میں ترجمان القرآن کے لیے قلم اٹھاتا میرا سارا ذہنی دروبست ایک نئی ترتیب اختیار کر لیتا۔ بعض لوگوں نے اس زمانے میں مجھ سے سوال بھی کیا کہ متعدد دائروں میں بیک وقت کام کرتے ہوئے ہر دائرے کا اندازِ کار اور اسلوبِ بیان کیسے تبدیل کر لیتے ہو، جیسے بجلی کا ایک بٹن دبایا تو لیمپ روشن ہو گیا، دوسرا دبایا تو پنکھا چل پڑا۔ حسبِ موقع کچھ جواب دے دیتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ یہ مداری کا ایک کھیل ہے کہ وہ ایک کوری کاپی کی ورق گردانی کر کے حاضرین کو دکھاتا ہے، پھر جب وہ دوسری بار اسے کھولتا ہے تو جہاں سے کھولتا ہے نقاشی اور

گل کاری کے نمونے سامنے آتے ہیں، پھر بند کر کے تیسری بار کھولتا ہے تو جو بھی ورق الٹتا ہے اس پر خوش خط مثنوی لکھی نظر آتی ہے، کبھی تمام صفحات پر انگریزی مضمون چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ امرِ حقیقی آج بھی یہ ہے کہ میرے ذہن میں دینی مباحث، ادبی افکار، صحافیانہ نوٹس، فلسفیانہ نظریات، نظموں، غزلوں اور نعتوں کے الگ الگ خانے اس طرح سے بنے ہیں جیسے کسی الماری کے ہوتے ہیں جس طرح کا کام سامنے آتا ہے، اسی کے مطابق ایک خاص خانے کو کھول کر اس میں سے فائل نکال لیتا ہوں اور کام شروع کر دیتا ہوں۔ تقریروں میں بھی، علمی تقریریں، سیاسی تقریریں، مساجد کی تقریریں اور تعلیم گاہوں کی تقریریں میرے ہاں بالکل الگ الگ اسٹائل پر مرتب ہوتی ہیں۔ خدا کے فضل سے یہ زنگارنگی کچھ نہ کچھ آج بھی قائم ہے۔ کوئی گھر بند نہیں! یہ محض خدا کی عنایت ہے، میرا کیا کمال!

اپریل ۱۹۵۰ء میں جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ملتان جیل سے رہا ہوئے تو موصوف کی رہائی کے چند ہی دن بعد میں نے ترجمان القرآن کی مجبورانہ ادارت سے سبکدوش ہونے کی درخواست بہ اصرار پیش کی، اور منظور ہو گئی۔ خدا جانے یہ خیال کیسے میرے ذہن میں آیا کہ اسی وقت سے برادر مرحوم پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب نے میری خالی کردہ جگہ کو پُر کیا۔ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ اس زمانے میں خود صاحب ترجمان القرآن ہی نے از سرِ نو ادارت سنبھال لی۔ پروفیسر صاحب کی تحریریں کبھی کبھی ادھر شائع ہوتی رہیں۔ مولانا محترم نے کام کی زیادتی کی وجہ سے ۱۹۵۸ء میں صدیقی صاحب کو ترجمان القرآن کی ادارت تفویض کی۔ شروع میں وہ میری طرح متوسط درجے کا کام کرتے رہے، لیکن مطالعہ و کاوش کے بل بوتے پر انھوں نے تیزی سے ترقی کی۔ پچھلے دو چار سال سے وہ جس معیار کے ساتھ اشارات لکھ رہے تھے، جو تفکر ان کی تحریروں میں کام کرتا تھا اور ہر قسم کے حالات میں جس واشگاف انداز سے وہ اظہارِ حق اور اعلان کرتے تھے۔ ان چیزوں کو سامنے رکھ کر میرے لیے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ میں اب کبھی ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریوں میں شریک ہوں گا۔ ترجمان القرآن کے لیے جو خانہ دماغ کی الماری میں کبھی مقرر کیا تھا، بند پڑے پڑے اس کے قفل اور قبضوں میں زنگ لگ چکا تھا۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی کی بیماری کے دوسرے شدید دور میں جب کہ ان کے لیے لکھنا پڑھنا بھی ممکن نہ تھا اور معالج کی طرف سے کچھ پرہیز بھی لازم کیا گیا تھا، صاحب ترجمان القرآن کی طرف سے اشارہ ہوا

کہ اس وقفے میں عارضی طور پر میں کم سے کم اشارات لکھ دیا کروں۔ امتثالِ امر کے لیے اشارات کے صفحات کو ٹیڑھی لکیروں سے بھر دینے کا عمل شروع کر دیا۔ اِسی دوران میں صدیقی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ان کا جنازہ پڑھ آنے کے بعد تک بھی مجھے یہ اندیشہ کبھی لاحق نہیں ہوا کہ ترجمان القرآن کی کوئی ذمہ داری مجھے اٹھانی ہوگی۔ اس کا حکم بھی اچانک ہی ملا۔ اور تحریکِ اسلامی کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں ایک اہم خدمت سے محض اس لیے فرار کروں کہ میری نگاہ میں میرا کام ویسا نہیں ہو سکتا تھا جیسا ہونا چاہیے تھا۔

میں اس موقع پر وہی بات کہتا ہوں جو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق کہی تھی کہ اے ابوبکر تم نے اس کام کو اپنے بعد والوں کے لیے مشکل تر بنا دیا۔ سو صدیقی صاحب کام کو ہمارے لیے زیادہ مشکل بنا گئے۔

عجیب بات ہے کہ میری ساخت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ میں ہمیشہ بے مزد کام کر کے خوشی محسوس کرتا ہوں۔ خصوصاً دینِ برحق یا تحریکِ اسلامی کی کوئی خدمت مجھ سے انجام پا سکے تو میری روح کی حقیقی مسرت اس صورت میں ہوتی ہے کہ کسی تنخواہ یا وظیفے کے بغیر جو کچھ بن آئے کرتا رہوں۔ دین یا تحریک تو بڑی چیز ہے، میں نے اگر اخبارات و رسائل میں کچھ لکھا تو بسا اوقات پیشکش ہونے کے باوجود کچھ لینا پسند نہیں کیا۔ کسی سے میں نے از خود کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ ہاں اکا دکا دوست ایسے بھی نکلے جنھوں نے از خود کبھی کبھار تھوڑا بہت احسان کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے بے نیازانہ مسلک کے لیے ایک جائیداد چاہیے یا مسلسل آمدنی دیتے رہنے والا کاروبار۔ یہ معاملہ اپنے ہاں صفر کے گول دائرے کے جوفِ خالی سے آگے نہیں بڑھا۔ مجبوراً گذر بسر کی راہیں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ بایں ہمہ جب معاوضے پر کام کرنے کا معاملہ آتا ہے تو گویا میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، اور دماغ کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ بہر حال ناشکرے پن سے خدا محفوظ رکھے اور کسی تعمیری و فلاحی خدمت کے ذریعے وہ اگر حلال روزی دے تو سوام خوری کے اِس دَور میں اُس کی بڑی عنایت ہے۔ ہم جیسے کمزور لوگ فاقہ مستی کو بھی تو سہ نہیں سکتے۔ ایسا ایک ہفتہ گزارنا پڑے تو سب کچھ زیر و زبر ہو جائے۔

اب جب کہ یہ ذمہ داری میرے حصے میں آگئی ہے اور میں اپنے سے بہتر کسی آدمی کے سامنے آنے تک

اسے نبھانے کی کوشش کروں گا، میرا جی چاہتا ہے کہ امکانی حد تک ایسی بہترین خدمات انجام دے سکوں جو اس موقر مجلے کے شایانِ شان ہو۔ یہ مجلہ جس نے بے شمار افرادِ ملت اور خصوصاً نوجوانوں کی زندگیوں کا نقشہ بدل دیا ہے

ہم جس نازک دَور میں سے گذر رہے ہیں، وہ باطل کی ترکتازیوں کے عین درمیان تحریکاتِ اسلامی کے اُبھرنے کا دَور ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خونخوار حملوں اور سازشوں اور مکاریوں کا دَور ہے۔ الحاد اور مادہ پرستی پر مبنی تہذیب مختلف نظاموں کے پیرایوں میں اپنے لاینحل تضادات کے درمیان بے بسی کے ساتھ گھری کھڑی ہے۔ ان تضادات کا اب کوئی حل سوائے اس کے نہیں کہ یہ زندگی کے ہر گوشے میں تصادم پیدا کریں اور موجودہ نقشہ تمدن درہم برہم ہو جائے۔ درحقیقت دَورِ نو کی شکست کا آغاز ہو چکا ہے۔ لیکن باطل مرٹنے سے پہلے زخمی سانپ کی طرح ہر اس زندہ وجود کو ڈس لینا چاہتا ہے جو سانپ نہیں ہے۔ چنانچہ اسلامی تحریکات کے خلاف دُنیا میں بڑے بڑے اژدر پھنکار رہے ہیں اور مسلمانوں کی نیش زنی کے لیے ایک نہ ایک سنپولیا بس گھول رہا ہے۔

خود پاکستان میں ایک طرف اسلامی نظامِ حیات کی طلب نیچے کی دعوتی سطح سے اُٹھ کر اُوپر کی سیاسی سطح تک آگئی ہے، اور دوسری طرف مغربی، اسرائیلی اور سوشلسٹ قوتیں نہ صرف اس کا رستہ روکنا چاہتی ہیں بلکہ سرے سے اس رجحان ہی کو ملیا میٹ کر دینا چاہتی ہیں۔ ایک مزاحمت اسلامی تحریکات کے خلاف ہو رہی ہے اور دوسری شقاوت جگہ جگہ مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے، کیونکہ ان سے اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ ان کا وزن اسلامی تحریکات کے پلڑے ہی میں جانا ہے۔

مگر نظر بظاہر قدرت کا نقشہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالات کی سنگین ناخوشگواریوں کے باوجود اسلام کو اُبھار کے اُوپر لانا چاہتی ہے —— اسی طرح جیسے فرعون کے گھر میں موسیٰؑ پروان چڑھے تھے۔

میرے سامنے یہ پیچیدہ احوال پوری طرح واضح ہیں۔ اور میں پہلے بھی جو کام جس دائرے میں کر رہا ہوں اسی جذبے سے کر رہا ہوں کہ اسلام کا بول بالا ہو، اور اب ترجمان القرآن کے ذریعے جو خدمت انجام دینے کا موقع مجھے نصیب ہوا ہے اسے بھی میں اسی مقصد کے لیے کام میں لانا چاہتا ہوں کہ لیقوم الناس بالقسط۔

میں چاہتا ہوں کہ صاحبِ ترجمان القرآن، دفتر ترجمان القرآن کے کارکن، جماعتی عمائد اور کارکن اور رسالہ کے قارئین سبھی میرے لیے دُعا کریں کہ میں خلوص اور قابلیت سے اس مشن کو پورا کر سکوں جیسے میں نے اجمالاً عرض کیا ہے۔ تمام توفیق اور نصرت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

(۲)

دَورِ حاضر کی قبا پر ذلت کا ایک اور سیاہ تمغہ آویزاں ہو گیا۔

برما کی سرزمین جہاں اسلام کی ابتدائی کرنیں فتح سندھ و ہند سے بھی پہلے پہنچ گئی تھیں، وہاں مسلمان ایک بڑی تعداد میں مدتِ دراز سے آباد تھے۔ انہوں نے جہاں اس سرزمین سے معاش حاصل کی، وہاں برما کی اقتصادی بہبود کے ساتھ ساتھ علمی، فکری، اخلاقی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے اس کی ترقی میں بھی حصہ ادا کیا۔ شریف و معزز قومیں نسلی اور مذہبی امتیازات کے بغیر ہر کسی کی تعمیری خدمات کی قدر کرتی ہیں۔ جہاں تک ہماری عام معلومات کا تعلق ہے، برما کے مسلمان نہ تو کسی بغاوت سے کبھی ملوث ہوئے، نہ وہ جرائم کیش تھے کہ آن کے خلاف حکومت من الحیث الجماعت کوئی تباہ کن اقدام کرنے میں برسرِحق ہوتی۔

کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے کہ برما کے بودھوں نے اشتراکی اثرات کے تحت اقتدار کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اختصاصی طور پر مسلمانوں کی مذہبی کمیونٹی کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے۔ شہریوں کی ایک اقلیت کے خلاف حکومت کی طرف سے ایک ایسی کارروائی کا ہونا جس کا مقصد اور عملی نتیجہ ان کو تہس نہس کرنا اور ملک کے حدود سے ان کو نکال کر باہر کرنا ہو، اس دَور کی اقوام کے دستوری اعلانات و روایات اور ادارۂ اقوام متحدہ کے بنیادی چارٹر کے خلاف ہے۔

کیا جواب ہے بودھوں کے پاس اس سوال کا کہ کیا تمہارا بدھ مت انسانوں کے ساتھ اور خصوصاً تمہارے ساتھ برسوں مل کر رہنے والی اقلیتوں کے ساتھ ایسے ہی سلوک کی تلقین کرتا ہے، کیا تمہارے مہاتما بدھ کی میراث نفرت اور تشدد ہے؟ کیا میدانِ جنگ اور عدالتی دائرے سے باہر انسانی جانوں کا اتلاف جائز ہے؟ کیا آباد گھروں کو اجاڑنا کوئی معقول حرکت ہے؟

دو ڈھائی لاکھ افراد کا اس حالت میں بنگلہ دیش کی سرحد کے اِس پار دھکیل دینا کہ ان کے مکانوں اور دکانوں کو جلا دیا گیا ہو، ان کے سامان لُوٹ لیے گئے ہوں، ان کے بے شمار افراد گولیوں سے بھون دیے گئے ہوں، ہزاروں عورتوں کے ناموس درندگی کا شکار ہو گئے ہوں، معصوم بچوں تک کے خون سے برما کی زمین کو رنگین کر دیا گیا ہو، نوجوانوں کو گرفتار کر کے سڑکوں کی تعمیر کرانے کے لیے بیگار میں لگا دیا گیا ہو،

اور خوف و ہراس کے اس عالم میں ۵۰ لاکھ مسلمانوں کی پوری آبادی ذہنی طور پر اکھڑ چکی ہو اور ہر فرد اور ہر گھرانا اسی سوچ میں ہو کہ وہ کب کدھر سے ہو کر کہاں چلا جائے، تو اس ساری صورتِ حالات کو برما کی حکومت کے ایک سنگین مجرمانہ فعل کا آئینہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔

بنگلہ دیش خود کثیر آبادی کا ایک محدود الوسائل ملک ہے اور مغربی پاکستان سے الگ ہونے کے بعد وہ ابھی تک اچھی طرح اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو پایا کہ اس کے سر پر اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا گیا ہے[1]۔ وہاں جو ہزارہا افراد پہنچ چکے ہیں اور جن کی آمد ایک قطارِ مسلسل کی صورت میں (تقریباً ۵ ہزار افراد روزانہ) جاری ہے۔ ان کے لیے سر چھپانے کے انتظامات کیے جاتے ہیں (درآنحالیکہ شدید بارشوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے) جو ابھی بہت محدود اور بہت ناقص شکل میں ہیں، ان کے لیے غذا کی فراہمی کے علاوہ پینے کے صاف پانی کی رسد کا بھاری مسئلہ حل طلب ہے، پھر اس بے گھر آبادی میں سے بھوک پیاس، نمونیے اور ہیضے سے مرنے والوں کی ایک کثیر تعداد نے دوا علاج کے معقول انتظامات کی اہمیت واضح کر دی ہے۔ یہ سارا بوجھ اُٹھانا بنگلہ دیش کے بس کا روگ نہ تھا، غنیمت ہے کہ بین الاقوامی سطح پر حرکت شروع ہو گئی ہے، اور قابلِ رشک مثال ہے کہ اسلامی سیکرٹیریٹ کی طرف سے ۸ لاکھ ڈالر کی امداد دی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود تارکینِ وطن کا ایک تہائی حصّہ کچھ عرصے میں ختم ہو جائے گا۔ جو زندہ رہیں گے وہ بھی انتہائی تکلیف دہ حالات میں رہیں گے جیسا کہ دُنیا میں کیمپوں کی (باقی اشارات بر صفحہ ۲۹)

---

[1] درحقیقت یہ ایک پر اسرار معاملہ ہے۔ کبھی کبھی کسی آبادی کا ملک بدر کرنا یا اس کا ہجرت کرنا بڑے بڑے حوادث کا باعث بنتا ہے۔ سابق مشرقی پاکستان سے کچھ صحیح اور کچھ غلط طور پر جو آبادی انڈیا گئی تھی۔ اسے انڈیا نے مشرقی پاکستان پر حملے کا سبب بنا لیا۔ اب معاملہ اُلٹ ہے۔ اگر بنگلہ دیش برما سے سخت رویّہ اختیار کرے تو برما کے پردے کے پیچھے سے اسی طرح کی کوئی اور قوت نکل آئے گی۔ جیسے انڈیا کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص منصوبے کے تحت یہ سارا ہنگامہ کھڑا کیا گیا ہو۔ افغانستان میں فوجی انقلاب، ایران میں مخالفِ حکومت ہنگامے، بنگلہ دیش میں برما سے نکالے ہوئے مسلمانوں کا مسئلہ اور پاکستان میں بھٹو کے پیدا کردہ بحران کے شاخسانے، ایشیا کے ان غیر اشتراکی ممالک میں واقعات کی آپس میں ملی ہوئی کڑیاں ہیں یا محض اتفاق ہیں۔

تعزیراتِ اسلام

از جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب - باغ - آزاد کشمیر

(۸)

فصل دوم

قتلِ عمد کی سزا

دفعہ ۲ ا - قتلِ عمد کی سزا اولاً قصاص ہے اور ثانیاً دیت ہے۔

ب - قاتل مقتول کے ترکہ سے بھی محروم ہوگا۔

ج - اگر جرم موجب قصاص ہو تو دیت کی سزا نافذ نہ ہوگی اِلّا یہ کہ مجرم دیت ادا کرنے پر آمادہ ہو اور ولیِ مقتول بھی دیت لینے پر راضی ہو۔

دفعہ ۳ شرائط موجب قصاص

ا - شرائط متعلقہ مجرم

۱ - مجرم عاقل ہو۔

۲ - بالغ ہو۔

۳ - اگر قتل کرنے میں ایک سے زائد افراد شریک ہوں تو ان میں ایسا آدمی شریک نہ ہو جو اگر اکیلا جرمِ قتل کا مرتکب ہوتا تو اُس کو قصاص کی سزا نہ دی جاسکتی۔

ب - شرائط متعلقہ مقتول

۱ - مقتول ایسا شخص ہو جس کا خون بہانا شرعاً ہمیشہ کے لیے ممنوع ہو۔

۲ ۔ مقتول، قاتل کا جزء نہ ہو۔

۳ ۔ مقتول کا ولی معلوم ہو۔

۴ ۔ مقتول کا ولی ایسا شخص ہو جس کو قاتل سے قصاص کا حق حاصل نہ ہو۔

ج ۔ شرائط متعلقہ جرم موجب قصاص

۱ ۔ جرم عمداً کیا گیا ہو۔

۲ ۔ عمداً جرم کرنے کی صورت میں قاتل کے نزدیک ایسی کوئی معقول دلیل موجود نہ ہو کہ اس کے نزدیک مقتول کا خون بہانا شرعاً مباح تھا۔[۱]

۳ ۔ قتل، حق دفاع کے طور پر نہ کیا گیا ہو۔

۴ ۔ قتل دارالحرب میں نہ کیا گیا ہو۔

۵ ۔ عمداً زخم لگانے کی صورت میں اگر مجروح کچھ عرصہ بعد اس زخم کے سرایت کرنے کی وجہ سے فوت ہو جائے اور زخم لگانے اور مجروح کی موت کے درمیان اور کوئی سبب موت واقع نہ ہو۔

۶ ۔ قصاص جزوی یا کلی معاف نہ کیا گیا ہو۔

۷ ۔ مال پر ولی مقتول نے قاتل سے صلح نہ کی ہو۔

۸ ۔ محل قصاص فوت نہ ہوا ہو۔

و ۔ ب اور ج میں ذکر کردہ شرائط سے اگر کوئی شرط فوت ہو جائے تو قصاص کی سزا ساقط ہو گی۔

تشریحات متعلقہ دفعہ ۲، ۳

تشریح ۱ ۔ احکام شرعیہ کا تعلق چونکہ مکلف شخص سے ضروری ہوتا ہے لہٰذا غیر مکلف مثلاً نابالغ یا مجنون اگر قتل کا جرم کریں تو ان کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ ان کا جرم موجب تاوان ہو گا۔

تشریح ۲ ۔ مستحق قصاص کے ساتھ غیر مستحق کی شرکت سے قصاص ساقط ہو گا

قتل عمد میں شرکائے قتل میں اگر کوئی ایسا شریک ہو جو قتل کرنے میں اگر منفرد ہوتا تو قصاص کی سزا اس پر

---

[۱] البدائع ص ۲۳۴ ج ۷ ۲ جلد نمبر ۷

نافذ نہ ہوتی، تو ایسی صورت میں تمام شرکائے قتل سے قصاص کی سزا ساقط ہو گی[۱]

تمثیل: مندرجہ ذیل صورتوں میں شرکائے قتل سے قصاص ساقط ہو گا۔

۱۔ بیٹے کو قتل کرنے میں باپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص شریک ہو۔

۲۔ عمداً قتل کرنے والے کے ساتھ خطاءً قتل کرنے والا شریک ہو۔

۳۔ عاقل کے ساتھ مجنون شریک ہو۔

۴۔ بالغ کے ساتھ نابالغ شریک ہو۔

۵۔ انسان کے ساتھ قتل کرنے میں سانپ وغیرہ یا کوئی درندہ شریک ہو[۲]

۶۔ ایک آہنی یا مثل آہنی ہتھیار سے قتل کرے اور دوسرا لاٹھی وغیرہ کے ساتھ قتل کرنے میں شریک ہو[۳]

اس طرح کی جملہ صورتوں میں قصاص کی سزا ساقط ہو گی البتہ دیت واجب الادا ہو گی جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

اگر قاتل ایسا ہو کہ منفرد ہونے کی صورت میں اس کو قصاص کی سزا نہ دی جاتی ہو تو ایسے شخص کی عاقلہ پر دیت ادا کرنی واجب ہو گی اِلّا یہ کہ باپ اور اس کے شریک پر دیت اُن کے اپنے اپنے مال سے واجب الادا ہو گی[۴]

تشریح ۳ عصمتِ دم

قصاص کی سزا میں فقہا کا اس بات میں تو اتفاق ہے کہ یہ سزا صرف اسی صورت میں دی جائے گی جب کہ مقتول ایسا شخص ہو جس کا خون بہانا شرعاً ہمیشہ کے لیے ممنوع ہو[۵] البتہ عصمتِ دم (خون کی حفاظت) کی بنیاد کیا ہے اس میں اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک عصمتِ دم کی بنیاد اسلام ہے یعنی جو شخص اسلام قبول کرے اس کا خون بہانا ہمیشہ

---

[۱] ردالمحتار ص ۳۵۵ جلد ۵ ص ۳۰۱ جلد ۵ [۲] ایضاً

[۳] ردالمحتار ص ۳۵۵ جلد ۵ [۴] ایضاً

[۵] البدائع ص ۲۳۶ جلد ۷ مطبوعہ بیروت

کے لیے ممنوع ہو جاتا ہے۔ امام مالک کا بھی یہی مسلک ہے[۱]۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عصمتِ دم کی بنیاد دار الاسلام ہے[۲]۔

فریقین کا ثمرہ اختلاف دار الاسلام کے اندر ذمی کے قتل اور دار الحرب کے اندر مسلمان کے قتل میں بخوبی ظاہر ہوتا ہے مگر ان دونوں کی جزئیات کافی تفصیل طلب ہیں لہٰذا اُن کو علیحدہ طور پر مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

تشریح ۴: ذمی کا قتل

الف: ذمی سے مراد وہ غیر مسلم شخص ہے جو دار الاسلام میں رہتا ہو ایسے شخص سے اسلامی حکومت جزیہ وصول کرتی ہے اور اس کے بدلے اس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس عہد و پیمان سے اس کا خون بہانا ہمیشہ کے لیے ممنوع ہو جاتا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ذمی اور کسی معاہد کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا اور دلیل میں یہ حدیث پیش فرماتے ہیں لَا یُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِکَافِرٍ وَلَا ذُوْعَھْدٍ فِی عَھْدِہٖ[۳]۔ یعنی مسلمان اور معاہد کو کسی کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا (اس حدیث میں) ولا ذوعھد کا عطف لفظ مسلمٌ پر ہے۔

احناف فرماتے ہیں کہ حدیث میں کافر سے مراد حربی ہے یعنی حربی کافر کے بدلے میں مسلمان کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا اس سے ذمی کے مقابلہ میں مسلمان کو قصاص میں قتل کرنے کی نفی ثابت نہیں ہوتی[۴]۔ جیسا کہ حدیث بالا کے پس منظر سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے۔

اس حدیث کا واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بنی خزاعہ کے ایک مرد نے قبیلہ ہذیل کے ایک مرد کو قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے درمیان عداوت موجود تھی تو فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جاہلیت کے خون کو کالعدم کرتے ہوئے فرمایا۔ اَلَا اِنَّ کُلَّ دَمٍ کَانَ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ فَھُوَ مَوْضُوْعٌ تَحْتَ قَدَمَیَّ ھَاتَیْنِ لَا یُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِکَافِرٍ وَلَا ذُوْعَھْدٍ فِی عَھْدِہٖ[۵]۔ یعنی جاہلیت کے زمانہ کا

---

۱ البدائع ص ۲۳۷، ۲۴۰ جلد ۷ مطبوعہ بیروت ۲ ایضاً ۳ ایضاً ص ۲۳۴

۴ احکام القرآن للجصاص ص ۱۴۲ جلد ۱ مطبوعہ بیروت

۵ احکام القرآن ص ۱۴۲ جلد ۱۔

خون میرے ان دو قدموں تلے رکھا ہوا ہے مومن اور معاہد کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔

زمانۂ جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے ساتھ عہد تو کر رکھا تھا مگر یہ عہد، عہدِ ذمہ نہ تھا اس لیے کہ عہدِ ذمہ فتح مکہ کے بعد ہوا ہے۔

یہ عہد جب کہ عہدِ ذمہ نہ تھا تو اس حدیث سے مومن کو ذمی کے بدلے میں قتل کرنے کی نفی ثابت نہیں ہوتی بلکہ ثابت یہ بات ہوتی ہے کہ مومن کو کافر حربی کے مقابلہ میں قتل نہ کیا جائے گا کیوں کہ اس وقت کافر حربی تھا۔

علاوہ ازیں خود امام شافعیؒ بھی یہ فرماتے ہیں کہ اگر ذمی دوسرے ذمی کو قتل کر دے اور پھر قاتل ذمی مسلمان ہو جائے تو اس کے باوجود اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

اگر محض اسلام کی وجہ سے قصاص ساقط ہوتا تو اس مسلمان ہونے والے ذمی سے قصاص ساقط ہونا چاہیے تھا لیکن خود امام موصوف بھی اس کے قائل نہیں ہیں تو معلوم ہوا کہ مسلمان کو ذمی کے مقابلہ میں قتل کرنا لَا یُقْتَلُ مُومِنٌ بِکَافِرٍ کے خلاف نہیں ہے[1]

احناف کے چند دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عبدالرحمٰن ابن سلمہ و محمد بن المنکدر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے کسی ذمی کو قتل کیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص میں اس کی گردن جدا کی اور فرمایا "اَنَا اَوْلٰی مَنْ وَفٰی بِذِمَّتِہٖ"[2] یعنی میں ان سب میں زیادہ حقدار ہوں کہ عہدِ ذمہ کو پورا کروں۔

۲۔ حضرت عمر۔ حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی مسلمان کو ذمی کے بدلے میں قصاص میں قتل کرنا منقول ہے[3]

۳۔ اہل حیرہ کا ایک آدمی جو ذمی تھا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ اے امیر المومنین۔ ایک مسلمان مرد نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے اور اس واقعہ کے گواہ میرے پاس

---

[1] مکمل تفصیل دیکھیے احکام القرآن ص ۱۴۳ جلد ۱

[2] ایضاً ص ۱۴۱ جلد ۱ و البحر ص ۳۳۷ جلد ۸

[3] احکام القرآن ص ۱۴۱ جلد ۱

موجود ہیں۔ چنانچہ مقدمہ کی تحقیق شروع ہوئی تو گواہوں نے واقعہ کی گواہی دی۔ پھر اُن گواہوں کا تزکیہ کیا گیا اور مسلمان کو قصاص میں قتل کرنے کا آپ نے فیصلہ صادر فرمایا۔ اسی اثناء میں مسلمان کے اقرباء نے ولی مقتول کو دیت پر راضی کر لیا۔ چنانچہ ولی مقتول حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں دیت وصول کر کے قصاص کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان کے اقرباء نے تم پر کوئی دباؤ ڈالا ہو اور تو دباؤ کے تحت ایسا کر رہا ہو اس نے کہا کہ میں نے اپنی مرضی سے ایسا کیا ہے۔ چنانچہ معاملہ کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قوم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

دِمَاءُنَا كَدِمَائِهِمْ وَدِيَاتُنَا كَدِيَاتِهِمْ[1] "یعنی ہمارا خون اُن کے خون کی طرح ہے اور ہمارا خون بہا اُن کے خون بہا کی طرح ہے"۔

آپ کا یہ قول و عمل مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل کرنے پر واضح ہے۔

۴۔ عبادیین، نصاریٰ کا ایک فرقہ تھا جو حیرہ کے اندر رہتا تھا۔ اس کے ایک آدمی کو مسلمان نے قتل کر دیا تو مقتول کا بھائی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور مقدمہ دائر کیا۔ آپ نے تحقیق کے بعد مسلمان کو قصاص میں قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس واقعہ کے بارے میں ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مقتول کے ورثا کو دیت پر صلح کرنے کے لیے لکھا تھا مگر قبل اس کے کہ یہ حکم پہنچتا وہ قتل ہو چکا تھا۔[2]

اس واقعہ سے بھی مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

تشریح ۴ (ب) مستأمن کے قصاص کا حکم

مستأمن کے احکام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اگر اس کو کوئی ذمی یا مسلمان قتل کر دے تو اُن کو قصاص میں قتل نہ کیا جائے گا۔[3]

۲۔ اگر مستأمن کو کوئی مستأمن قتل کر دے تو بھی قاتل کو قصاص میں قتل نہ کیا جائے گا۔[4] (کیونکہ اس کا خون دائمی طور پر محفوظ نہیں ہے)

(باقی)

---

[1] احکام القرآن للجصاص ص ۱۴۱ جلد ۱ [2] ایضاً [3] درمختار ص ۳۵۴ ج ۵

[4] قیاساً قصاص ہونا چاہیے تھا مگر استحساناً ساقط ہے۔ رد المحتار ص ۳۵۴ ج ۵

اسلامی انقلاب کے جانگسل تقاضے

از جناب سید اسعد گیلانی صاحب

اے آنکہ زنی دم از محبت | از ہستی خویشتن بہ پرہیز
برخیز و بہ تیغِ تیز بنشیں | یا از سرِ راہِ دوست برخیز

حضرت خبابؓ بن ارت سے روایت ہے:

"ہم نے آنحضورؐ کی خدمت میں اپنی مشکلات کی شکایت کی اس حالت میں کہ آپ کعبہ کے سایہ میں چادر پر ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ہم مشرکین کی سختیاں جھیل رہے تھے ہم نے عرض کیا "کیا آپ ہمارے لیے مدد نہ طلب فرمائیں گے۔ دعا نہ مانگیں گے"؟

آپؐ نے فرمایا ——— اور آپ کا چہرہ تمتا رہا تھا۔

"تم سے پہلوں کا یہ حال ہوا ہے کہ مردِ مومن کو پکڑا جاتا اور زمین میں گڑھا کھود کر اس میں اسے گاڑ دیا جاتا۔ پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ دیا جاتا اور دو ٹکڑے کر دیئے جاتے۔ اور گوشت ہڈیوں میں لوہے کی کنگھیاں پھیر دی جاتیں۔ لیکن یہ سب کچھ مردِ مومن کو دینِ حق سے باز نہ رکھتا۔ بخدا اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار صنعا یمن سے حضر موت تک سفر کرے گا۔ اور اسے خدا کے سوا اور بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا ——— لیکن تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو"؟ (بخاری)

بیعتِ عقبہ کے موقع پر رات کی مجلس میں مدینے کے ایک نوجوان اسعد بن زرارہ نے پورے وفد سے مخاطب ہو کر کہا:

"ٹھہرو اے اہل یثرب!

ہم لوگ جو ان (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آتے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور انہیں یہاں سے نکال لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی۔ لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو ——— اور اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو۔ کیونکہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہے"۔

عباس بن عبادہ بن نضلہ نے کہا:

"جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت لے رہے ہو؟"

آوازیں "ہاں جانتے ہیں"۔

"تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں گے تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر یہ ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے۔ اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہے کہ جو بلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے باوجود نبھاؤ گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے"۔

آوازیں آئیں "ہم اسے لے کر اپنے اموال کو تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں"۔[۱]

ایک غالب نظامِ زندگی کسی معاشرے پر اس طرح حاوی اور محیط ہوتا ہے جس طرح کسی کمزور اور نازک پودے پر آکاس بیل پوری طرح چھا گئی ہو۔ اس کے زنجیر نما تار پودے کا ایک ایک پتہ، ایک ایک کونپل، ایک ایک ٹہنی کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتے ہیں اور جب اس محیط بیل کی گرفت سے اس پودے کو آزاد کیا جائے تو بیل کا ایک ایک تار حلقۂ زنداں بن بن کر ایک ایک پتی اور شاخ پر مزاحمت کرتا ہے اور پودے کی آزادی کو اس طرح ناممکن بنا دیتا ہے جس طرح ناخن کا گوشت سے آزاد ہونا

[۱] تفہیم القرآن، دوم، صفحہ ۱۲۰-۱۲۱

دشوار ہوتا ہے۔

پورے معاشرے کو اس عملِ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں کرب و اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہوتا کہ یہ کام ٹھنڈے پیٹوں ہنسی خوشی انجام پا جائے جس طرح نازک جلد پر چپٹے ہوئے کنکھجورے کو علیحدہ کرنا ایک دشوار کام ہے کہ وہ اپنے لاتعداد زہریلے پاؤں گوشت کے اندر پیوست کیے رہتا ہے اور ایک ایک پاؤں کا اکھڑنا سخت درد و کرب کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح غالب نظام کے گڑے ہوئے پنجوں سے کسی معاشرے کی آزادی کا عملِ انقلاب بڑا جان جوکھوں کا کام ہے اور اسے وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنہوں نے سب طرف سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو قبول کیے ہوئے مقصد کے ہی اپنا آپ حوالے کر دیا ہو اور اس مقصد کو کامیاب کرنے کی خاطر اپنی ہستی کی ساری متاع جھونک دینے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہوں جن لوگوں نے کسی مقصد کو قبول بھی کیا ہو اور پھر اس کی راہ میں کچھ تحفظات (RESERVATIONS) بھی رکھتے ہوں۔ ان کا کام کوئی انقلابی عمل انجام دینا نہیں ہے بلکہ جب وہ انقلابی عمل کامیابی کے مراحل طے کر لے تو پھر اس کی خدمت کے لیے کرائے کے سپاہی بن جانا ہے۔

ہر انسانی معاشرہ زمانے کی کسی نہ کسی گردش کے ساتھ انقلاب سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے انقلابی عمل کا بروئے کار آتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ایسے انقلابی عمل کے موقع پر معاشرے میں کچھ قوتیں جو فکری لحاظ سے باہمی اختلافات رکھتی ہیں اور انسانی فلاح کے لیے مختلف پروگرام پیش کرتی ہیں، ضرور آپس میں کشمکش کرتی ہیں اور جس قدر اُن میں توانائی اور تضاد ہوتا ہے اسی نسبت سے وہ کشمکش کسی نتیجہ خیز صورت میں ظاہر ہونے سے پہلے جانگسل اور شدید ہوتی ہے ایسی تحریکیں حق پرستی کی مدعی ہوں یا باطل عزائم لیے ہوئے ہوں ان کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے اپنے مخالفین کے ساتھ کشمکش ضروری ہے اور اس کشمکش کے بغیر کوئی انقلابی عمل ظاہر نہیں ہو سکتا بلکہ اگر ظاہر بھی ہو جائے تو اُس کی بنیاد میں ضرور کوئی ایسی خرابی رہ جاتی ہے جو بہت جلد اسے کمزور کر کے منہدم کر دیتی ہے۔

انقلابی عزائم لے کر قربانیاں دینے کی مثالیں تاریخ انسانی میں ہر قابلِ ذکر تحریک کے دامن میں درخشاں جواہر کی طرح نظر آتی ہیں۔ جس کے پاس یہ چیز نہیں ہے تاریخ نے اپنے صفحات پر اسے کوئی جگہ نہیں دی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ تحریکیں جو حق کو مطمعِ نظر بنا کر اٹھیں اور جنہوں نے حق کا دامن پکڑا انہوں نے ایسی مثالیں پیش کرنے میں دنیا کی تمام باطل تحریکوں کے داعیوں کو بار بار مات دی ہے۔ اس لیے کہ باطل تحریکیں

مادّی منفعتوں کی لاگ سے بچ نہیں سکتیں اور مادی منفعت کی کمی بیشی خلوص اور معیارِ قربانی کو بھی کم و بیش کر دیتی ہے۔

انسانیت کے وجود میں آنے کے بعد سے ایک تحریک اسلامی ہی ہے جو تاریخ کے ہر دَور میں بار بار اُبھرتی رہی ہے۔ تحریک اسلامی سے مراد وہ تحریک ہے جس کے داعی اپنی قوم کو یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے) کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے انسانی تاریخ کے ہر دَور میں، کچھ کچھ زمانے کے وقفے کے ساتھ، صدیوں کے گذرنے کے ساتھ، تہذیبوں کے بدلنے کے ساتھ، تمدن کی ترقی کے ساتھ، ہر دَور میں ہر جگہ پیہم اور بار بار آتے رہے ہیں اور یہی ایک بات کہہ کر اپنی تحریک کا آغاز کرتے رہے ہیں۔

—— اللہ کی حاکمیت تسلیم کرو اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

—— رسول کی اطاعت کرو اس لیے کہ وہ اللہ کا پیغام لاتا ہے اور اس پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔

—— آخرت میں خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس لیے کہ وہ لازماً منعقد ہوگی۔

بار بار یہی دعوت مختلف زبانوں اور مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے سامنے مسلسل پیش کی جاتی رہی ہے اور اس دعوت کے داعیوں کو انسانوں کی طرف سے یکساں طرزِ عمل کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ تردید، تکذیب، ترغیب اور جبر و تشدد سے ہمیشہ اس دعوت کا جواب دیا جاتا رہا ہے۔ دعوتِ انقلابِ اسلامی کے علمبرداروں کو ہمیشہ ستایا گیا، ان کی باتوں کا جواب ظلم و جور کے ہتھیاروں سے دیا گیا۔ کسی کو مجنون قرار دیا گیا۔ کسی کو جادوگر کہا گیا۔ کسی کو وطن سے نکال باہر کیا گیا۔ کسی کو آگ میں جھونکا گیا۔ کسی کو قتل کیا گیا۔ کسی کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ کسی کا بائیکاٹ کیا گیا۔ کسی کے ماننے والوں کے خاندانوں کو قوت کے زور سے تباہ و برباد کیا گیا۔ کسی کو صلیب پر لٹکانے کے منصوبے بنائے گئے اور کسی کو آروں سے چیر دیا گیا۔ غرض آپ دعوتِ اسلامی کو تسلیم کرنے والوں کی آزمائشوں پر نظر ڈالیں تو قربانیوں کی یہ درخشاں داستانیں انسانیت کے جوہر کا بہترین نمونہ ہیں۔ کسی کو پہاڑ سے گرایا گیا۔ کسی کو کوئلوں پر لٹایا گیا اور کسی کو تپتی ریت اور جھلستے ہوئے پتھر کی سلوں کے نیچے دبایا گیا۔ کسی کو زنجیریں ڈالی گئیں، اور کسی کے بدن کا ایک ایک عضو کاٹ کاٹ کر پھینکا گیا۔ کسی کو گھاس اور پتے اور خشک چمڑا بھون کر کھانا پڑا تو کسی کو مارتے مارتے نیم جان کر دیا گیا۔ کسی کے پیچھے اوباشوں کی ٹولیاں پھرتی اور اسے لہولہان کرتی رہیں۔ کسی خاتون کو نیزہ مار کر شہید کر دیا گیا تو کسی کے گلے میں رسی ڈال کر اُسے گھسیٹا گیا۔ کسی کے اپنے جگر کے ٹکڑے تلواریں کھینچ کر اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے اور اُسے اُن کے ساتھ نسل اور خون کا نہیں

بلکہ حق پرستی اور مقصد زندگی کا حساب چکانا پڑا۔ اس دعوتِ حق کے نتیجے میں کسی کی جائداد لوٹ لی گئی۔ کسی کے مال تباہ ہوئے اور کسی کے کاروبار بیٹھ گئے، جو زیبا و حریر پہنتے تھے ان کو پورا کفن بھی نصیب نہ ہو سکا۔ ان کے جسم پر چیتھڑوں کے سوا کوئی لباس نہ رہا۔ کسی کو بیس بیس سال کوڑے کھانے پڑے اور جیلوں میں سڑنا پڑا اور کسی کے بازو اکھڑوا دیے گیے۔ کسی کو زہر دیا گیا۔ اور کسی کو راہِ حق میں لہو کے پیاسے ہزاروں دشمنوں کی فوجوں سے تنہا لڑ کر جان دے دینا پڑا۔ ان ان مراحل سے گذر گذر کر حق پرستوں کا قافلہ رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچتا رہا ہے۔

غرض انسانیت کی تاریخ میں اگر کوئی گراں سرمایہ ملتا ہے اور کہیں کوئی جوہر دکھائی دیتے اور ظاہر ہوتے ہیں تو اسی وقت جب کوئی اسلامی انقلابی عمل کسی انسانی معاشرے میں برپا ہوتا ہے اور اس کے بروئے کار لانے اور اس کی مزاحمت کرنے کے لیے انسان دو صفوں میں بٹ کر آمنے سامنے آجاتے ہیں، 'حق دشمنی' اور 'حق پناہی' کا جب کبھی یہ معرکہ زمین پر برپا ہوتا ہے تو قدسیوں کی نگاہیں اس کے نتائج پر لگ جاتی ہیں۔ اور انسانی تاریخ ایک نئے باب کا افتتاح کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

اسلامی تحریک دراصل بنی نوع انسان کے صالحیت پسند ضمیر کی اجتماعی کوششوں سے وجود میں آتی ہے اور چونکہ انسان کو صالحیت پسندی قدرت نے اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی ہے اس لیے انسانی معاشرہ جو ازل سے ابد تک اپنی مخصوص فطرت کے ساتھ نسل در نسل رواں دواں ہے جب گمراہی اور ضلالت کے بوجھ تلے دبا دبا اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اجتماعی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے تو اس کا اجتماعی ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور اس معاشرے میں تحریک اسلامی برپا ہو جاتی ہے جو فسق و فجور ضلالت و گمراہی اور ظلم و تشدد اور ناحق پرستی کے خلاف کشمکش کرتی ہے اور جب یہ کشمکش چلتی ہے تو تحریک کے داعی اور اس کے ساتھی جسم و جان، مال و جائداد اور رشتہ و ناتہ کی متاع لے کر قربانی کے لیے میدانِ عمل میں آجاتے ہیں۔ ان کے میدانِ عمل میں آتے ہی اللہ تعالیٰ کی وہ غیبی قوتیں بروئے کار آتی ہیں جو حق و باطل کے ٹکراؤ پہ حق کا ساتھ دیتی اور باطل کو تہس نہس کر دیتی ہیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہی ہے کہ صالحین کا ایک گروہ جرأت و ہمت کے ساتھ میدانِ عمل میں حق کی حمایت کرتا ہوا نکلے اور باطل کے لوہے سے اپنا لوہا ٹکرائے۔

پاکستان کی نظریاتی اساس ـ دعوے اور عمل

محمد نواز ـ ایم ـ اے

(۲)

نظریۂ پاکستان کی اوّلین بنیاد اسلام اور صرف اسلام پر مبنی قومیت کے جداگانہ تصور پر قائم تھی اور اس کے ساتھ اس کی دوسری اساس جمہوریت تھی ـ قائداعظم مرحوم کے بعد ہر دور کے حکمرانوں نے جیسے اسلام اور نظریۂ پاکستان کی مدح سرائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی بعینہٖ اسی طرح جمہوریت کی اہمیت اور ضرورت پر بھی بڑی قصیدہ خوانی کی یہاں تک کہ جمہوریت کے قاتلوں نے بھی اس کے حق میں وعظ کہے ـ

یہ واقعہ ہے کہ پاکستان جمہوریت اور جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہوا تھا ـ اس کی بقاء اور اس کے استحکام کا انحصار بھی جمہوریت اور جمہوری اداروں کے ذریعے ممکن ہے ـ اگر پاکستان میں جمہوریت کی راہ نہ روکی جاتی تو یہ ملک نہ صرف مستحکم ہوتا بلکہ جلد یا بدیر اسلامی نظام کی نعمت سے بھی بہرہ ور ہو سکتا تھا ـ لیکن بدقسمتی سے یہاں جمہوری روایات جڑ نہ پکڑ سکیں اور ایوب خان کے مارشل لا نے اس کے رہے سہے امکانات بھی ختم کر دیئے ـ ایوب خان جو پاکستان میں جمہوریت کا سب سے بڑا قاتل خیال کیا جاتا تھا اُسے بھی اپنے اس جرم کا احساس تھا، اس پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے اپنی قوم کو بار بار یقین دلانا پڑا تھا اور یہ اعلان کرنا پڑا تھا کہ، [۲۵]

"میں صاف صاف اعلان کرتا ہوں کہ ہمارا آخری مقصد یہ ہے کہ جمہوریت کو بحال کیا جائے"ـ

(پہلی نشری تقریر ۸ راکتوبر ۱۹۵۸ء)

[۲۵] پروفیسر خورشید احمد ـ آئین کی تدوین ص ۱۴۸

پھر اپنی پہلی پریس کانفرنس میں یہ یقین دلایا کہ :

" ملک صرف میرا نہیں بلکہ ان سب کا ہے جو اس میں رہتے ہیں اس لیے کسی مرحلہ پر ان سے حکومت کو وابستہ کرنا ہوگا" (۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء)[25]

" نمائندہ حکومت کا قیام ملک کے مستقبل کے لیے ضروری ہے" (خطاب ۲۳ مارچ ۱۹۵۹ء)[26]

نظریہ پاکستان کی اس واضح اور مبہم تشریح کے باوجود ایوب خاں نے اپنی کابینہ کے دو نامور وزراء منظور قادر مرحوم اور ذوالفقار علی بھٹو کی مدد سے ۱۹۶۲ء میں جو دستور تصنیف کرکے قوم کو دیا تھا وہ نہ اسلامی تھا اور نہ جمہوری ۔۔۔ اس دستور کے نفاذ کے بعد جب ملک میں سیاسی سرگرمیاں بحال ہوئیں تو ملک کے دونوں حصوں میں اس دستور کے خلاف زبردست ردعمل پیدا ہوا جس کے نتیجے میں ایوب خاں کو اپنے دستور میں نظریۂ پاکستان کے مطابق ضروری ترامیم کرنی پڑیں ۔ اس دستور میں پہلے پاکستان کو محض "جمہوریہ" قرار دیا گیا تھا نئی ترمیم کے ذریعے اسے دوبارہ " اسلامی جمہوریہ" تسلیم کر لیا گیا ۔ دستور میں پہلے قرارداد مقاصد کو شامل نہیں کیا گیا تھا مگر بعد میں رائے عامہ کے زور دیکھ کر اسے بھی شامل کر دیا گیا ۔ رائے عامہ کے دباؤ ہی سے مجبور ہوکر بنیادی حقوق اور ان تمام اسلامی دفعات کو جو پاکستان کے سابق دساتیر میں درج تھیں بالآخر ۱۹۶۲ء کے دستور میں بھی شامل کر دیا گیا ۔

ایوب خاں کے زوال کے بعد آغا محمد یحییٰ نے ملک کے دوسرے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے اپنے قانونی ڈھانچہ کے پہلے فرمان کے ذریعے نظریہ پاکستان کے تحفظ کی مکمل ضمانت دی ۔ پاکستان کے پہلے عام انتخابات اسی قانونی ڈھانچہ کے تحت ہوئے ۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس قانونی ڈھانچہ کو تسلیم کرکے انتخابات میں حصہ لیا ۔ ملک کی وہ جماعتیں بھی جن کا تعلق بائیں بازو سے تھا ۔ اور جن کے منشوروں میں سیکولرازم اور سوشلزم شامل تھا ۔ اور جو ملک میں لسانی، علاقائی اور قبائلی تعصبات بھڑکا رہی تھیں ۔ قانونی ڈھانچہ کی وجہ سے نظریہ پاکستان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئیں اور انہوں نے اپنے انتخابی پروگرام میں نظریہ پاکستان کے تحفظ کا اقرار و اعلان کیا ۔

ان انتخابات میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں نے پاکستان کی

---

[25] [26] پروفیسر خورشید احمد ۔۔۔ آئین کی تدوین ص ۱۳۸

نظریاتی اساس کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا وہ روزنامہ "ڈان" (۲۹ نومبر ۱۹۷۰ء) کی رپورٹ کے مطابق حسب ذیل تھا:

۱۔ پاکستان عوامی لیگ:۔

"اسلام کا اس حیثیت سے اعتراف کہ یہ عوام کی عظیم اکثریت کا گہرا اور راسخ دین ہے اور اس بات کی ضمانت کہ کوئی قانون قرآن وسنّت کے خلاف وضع نہیں کیا جائے گا۔ نیز اس امر کی ضمانت کہ تمام مذہبی ادارات کے تقدس کی حفاظت کی جائے گی اور دینی تعلیم کا احترام تمام سطحوں پر کیا جائے گا۔"

۲۔ نیشنل عوامی پارٹی:۔

"ملک کی محبت، اس کے اتحاد اور خوش حالی کی سعی، اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی اصولوں کی پاسداری، نیز آزادی اور اخوت کے ان اصولوں کی ترویج جو قرآن وسنّت میں مرقوم ہیں"۔

نظریۂ پاکستان کے اس اعتراف واظہار کے باوجود یہ پارٹیاں نظریۂ پاکستان اور ملک وملت کے حق میں بے وفا ثابت ہوئیں۔ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ پاکستان میں رہ کر وہ نظریۂ پاکستان کی علانیہ مخالفت نہیں کرسکتیں۔ ملتِ پاکستان کو اگر دھوکا دیا جا سکتا ہے اور ملک اور قوم کے خلاف اگر کوئی سازش کی جا سکتی ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ایک طرف نظریہ پاکستان کا راگ اونچے سُروں میں الاپا جائے تاکہ لوگ مطمئن رہیں کہ ان کے ساتھ فریب نہیں ہو رہا ہے اور دوسری طرف ملک اور قوم کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرکے اس ملک کی سالمیت پر کاری ضرب لگائی جائے۔ چنانچہ ان دونوں پارٹیوں نے منافقت اور غداری کا ڈرامہ سٹیج کرکے ملک کو بالآخر ایسے المناک انجام سے دوچار کیا جس کے مقابلے میں ہسپانیہ کے المیے گرد ہوکر رہ گئے۔ اس المناک داستان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہاں یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ نظریۂ پاکستان اتنی واضح حقیقت تھی جس کا انکار بائیں بازو کے انتہا پسند عناصر بھی کھل کر نہ کرسکے۔

۳۔ پاکستان پیپلز پارٹی:

پاکستان پیپلز پارٹی کا کھلا ننگا تعلق بائیں بازو سے تھا، اس کے قائدین کے اعلانات اور اس کی سیاسی سرگرمیوں کا ہدف صاف طور پر سوشلزم اور صرف سوشلزم تھا، مگر اس پارٹی کو بھی نظریۂ پاکستان کی علانیہ مخالفت کی جرأت نہ ہوئی، اس نے عوام کو مغالطہ دینے کے لیے صاف طور پر اقرار کیا کہ:۔

"اسلام ہمارا مذہب ہے، جمہوریت ہمارا سیاسی مسلک ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے"۔

"دین اسلام کے محترم تصورات کی تعمیل تاکہ ایسی غیر طبقاتی سوسائٹی وجود میں آسکے جو معاشیات اور سماجی انصاف اور اخوت و مساوات پر مبنی ہو۔ یہ وہ مقصد ہے جو اسلام کے سیاسی و سماجی اخلاقیات کا متقاضی ہے" (حوالہ بالا)

پیپلز پارٹی نے سوشلزم کا بڑی شدّ و مد کے ساتھ نعرہ لگایا تھا مگر جب ملک میں اس کے خلاف شدید ردّ عمل پیدا ہوا تو سوشلزم کے مقابلہ میں "مساوات محمدی" کی اصطلاح اپنا لی گئی اور سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا اضافہ کر لیا گیا۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے نظریاتی اعتبار سے یہ پسپائی تھی یا عوام کو جھانسہ دینے کی ایک سعیٔ ناکام۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو اسلام کے ساتھ عقیدت و وابستگی کے اس اظہار و اعلان کے باوجود پیپلز پارٹی نے سوشلزم کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو جانے کے بعد اس پارٹی کے چیئرمین نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔ ملک کا تیسرا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننا پسند کیا اور وہ ایک عرصہ تک اس بات پر بضد رہے کہ ملک پر مارشل لاء مسلط رہے، کچھ عرصہ بعد انھوں نے ایک عبوری دستور نافذ کیا جس میں اگرچہ زیب داستان کے طور پر اسلام اور جمہوریت کا نام استعمال کیا گیا تھا مگر دراصل وہ مارشل لاء ہی تھا جسے آئینی اور دستوری شکل دے دی گئی تھی۔

جب پیپلز پارٹی کے سربراہ نے مستقل دستور کا مسودہ قومی اسمبلی کے سامنے پیش کیا تو اس میں بھی ایوب خاں کے دستوری مسودہ کی طرح پاکستان کو محض "جمہوریہ" قرار دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ "اسلامیہ" کے اضافہ کو غیر ضروری خیال کیا گیا تھا۔ "سوشلزم" کو اس دستوری مسودہ میں جگہ دی گئی تھی۔ تاکہ پاکستان میں اسلام کے مقابلے میں اس کے نظریاتی وجود کو نہ صرف تسلیم کر لیا جائے بلکہ اسے دستوری اور آئینی تحفظ بھی حاصل ہو جائے۔ اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی نے اس دستوری مسودہ کے ذریعہ پاکستان کی نظریاتی اساس پر بھرپور وار کیا اور جمہوری اصطلاحات کے پردے میں ملک کے لیے آمرانہ نظام کا ڈھانچہ تجویز کیا۔

ان ساری مساعی نامحمود کے باوجود پیپلز پارٹی اپنے ارادے میں ناکام رہی۔ اگرچہ وہ مقبولیت کے بامِ عروج پر تھی مگر جب عوام نے اس کے ان خلاف اسلام اور مخالفِ جمہوریت اقدامات کو دیکھا تو ان

میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی، عوامی ضمیر تڑپ اٹھا، منتشر اور کمزور حزب اختلاف نے بے مثال جرأت سے کام لے کر رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بنا لیا - اور حکمران گروہ پر رائے عامہ کا شدید دباؤ ڈالا۔

حکمران جماعت بالآخر اس عوامی دباؤ کے سامنے جھک گئی - اس نے دستور سے سوشلزم کی اصطلاح کو نکال دیا، نظریہ پاکستان کو واضح طور پر تسلیم کیا۔ اور اسے تمام سابقہ دساتیر کی اسلامی دفعات کو اپنے دستور میں جگہ دینی پڑی - مملکت کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" تسلیم کر لیا گیا - حزب اختلاف نے اپنے تمام مطالبات تسلیم کرا لیے اور دستور پر متفق ہو گئی - اس دستور میں اب نظریہ پاکستان پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

اس دستور کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱- اسلام اور صرف اسلام ہی پاکستان کی اساس ہے اور اسلام ہی پاکستان کا سرکاری مذہب ہے۔

۲- ملک کا نظام جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق چلے گا۔

۳- پاکستان میں اسلام کے ماسوا کسی نئے "ازم" یا کسی نئے مدعی نبوت کے لیے کسی قسم کی گنجائش موجود نہیں اور ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے والا شخص غیر مسلم تصور کیا جائے گا۔

۴- اس بات کی ضمانت دی گئی کہ ملک میں کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا، اور قوانین کو قرآن و سنت کے قالب میں ڈھالا جائے گا۔

۵- یہ بھی طے کر دیا گیا کہ پاکستان کے مسلمانوں کی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے اور ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں گے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔ اور پاکستان میں صحیح اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر ہو سکے۔

۶- بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت بھی دی گئی - بعض خامیوں کے باوجود اس متفقہ دستور میں نظریہ پاکستان کو کافی حد تک سمو دیا گیا۔

پاکستان کے حکمران اور سیاسی رہنماؤں کی نمائندہ تقریروں اور تحریروں اور ملک کے اب تک کے تمام دستوری دستاویزات کی روشنی میں ہم بلاخوف تردید حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:-

۱- پاکستان کے حصول کا مقصد صرف اور صرف اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اسی مقصد کے لیے جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانیاں پیش کی تھیں - جو لوگ قیام پاکستان کے

مادی یا معاشی محرکات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں کیونکہ اگر پاکستان کا مقصد معاشی یا مادی ہوتا تو برصغیر کے وہ مسلمان جو اقلیتی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے تحریک پاکستان میں پیش پیش نہ ہوتے۔ یہ تحریک وسط ہند سے اُٹھنے کے بجائے پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد اور بنگال جیسے مسلمان اکثریتی علاقوں سے اُٹھتی، تحریک کی قیادت و رہنمائی انہی علاقوں کے مسلمانوں کو حاصل ہوتی اور اکثریتی علاقوں کے مسلمان پاکستان کے لیے مقابلتاً زیادہ قربانیاں پیش کرتے۔ مگر یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کی لہریں مسلمان اقلیتی علاقوں میں جتنی تند و تیز تھیں اکثریتی علاقوں میں اتنی تند و تیز نہ تھیں۔ آخر وہ کونسا مادی یا معاشی مفاد ایسا تھا جس پر فریفتہ ہو کر یو پی۔ سی پی اور بہار کے مسلمانوں نے اپنی جان، مال اور اپنی عزت و آبرو حتیٰ کہ اپنی آیندہ نسلوں کے مستقبل تک کو داؤں پر لگا دیا تھا۔

۲۔ پاکستان میں اسلام کو متنازعہ فیہ حیثیت حاصل نہیں۔ ہر حکومت نے اسلام کا نام استعمال کیا، ہر پارٹی نے اسے اپنے منشور میں جگہ دی۔ ہر لیڈر نے بڑے زور سے اسلام ہی کا نعرہ لگایا۔ وہ لوگ جو ملک توڑنے کے درپے تھے انہوں نے بھی اسلام کا نام لیا۔ وہ بھی جنہوں نے اپنی آمریت کے تخت سجائے، اسلام ہی کا راگ الاپتے رہے اور وہ بھی جو ملک سے اسلام کو ختم کر کے، سوشلزم، سیکولرزم اور جاہلی ثقافتوں، جاہلی تعصبات اور علاقائی قومیتوں کا پرچار کر کے ملک کی نظریاتی حیثیت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اور ملکی سالمیت کو برباد کرنا چاہتے تھے، اسلام کا نام لینے پر مجبور ہوئے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس ملک میں اسلام کا ٹھپہ لگائے بغیر ان کا کوئی سکہ نہیں چل سکتا۔ چونکہ عوام اسلام کے ساتھ محض جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ انہیں اسلام کا صحیح شعور نہیں لہٰذا ہر کھوٹے سکے پر اسلام کا لیبل لگا کر اسے چلایا جا سکتا ہے۔

۳۔ یہ بات بھی ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ جس طرح اسلام پاکستان کے قیام کا سبب بنا تھا اسی طرح اس کے بقاء و استحکام اور اس کی سالمیت بھی اسلام اور صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو لوگ پاکستان میں اسلام کی راہ روکنے کی سازش میں مصروف ہیں وہ دراصل اس ملک ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں ۔۔ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں پر حملہ کرنے والے اس کی جغرافیائی سرحدوں پر حملہ کرنے والوں سے کم خطرناک نہیں بلکہ اُن کا حملہ کچھ زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ہماری جغرافیائی سرحدوں پر حملہ کرنے والے دشمن ہماری

آزادی سلب کرنے کے درپے ہوں گے اور وہ ہمیں سیاسی اعتبار سے مفلوج کرنا چاہتے ہوں گے جب کہ ہماری نظریاتی سرحدوں پر حملہ کرنے والے مارہائے آستین ہمارے قومی اور ملی وجود ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں مسلمان نام کی امت بحیثیت ملت کے ختم ہو جائے۔

۴۔ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات کے بھرپور اظہار کے لیے آمرانہ فضا سخت ناسازگار ہے۔ آمریت کی فضا میں اسلام اپنے حقیقی جوہر آشکارا نہیں کر سکتا، اس کے لیے موزوں فضا جمہوریت کی ہے۔ اگر جمہوریت ہوگی تو اسلامی نظریۂ حیات زندگی کے ہر میدان میں پیش قدمی کرے گا۔ جمہوریت کے بغیر اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کا عمل جاری نہیں رہ سکتا۔ جمہوریت اور اسلام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یہاں اگر اسلام ہوگا تو جمہوریت ضرور ہوگی اور جمہوریت ہوگی تو اسلام غالب اور کارفرما طاقت کی حیثیت سے ابھرے گا۔ اور یہ بات ملک اور قوم کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان میں جمہوریت کو فروغ نصیب نہ ہوا تو اسلام کی منزل دور سے دور تر ہوتی چلی جائے گی اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر پاکستان کا دفاع اور تحفظ ممکن نہ ہوگا۔ پھر یہ ایک ایسا ملک ہوگا جسے دشمن بغیر کسی مزاحمت کے فتح کر لیں گے۔ اس لیے ملک اور قوم کا کوئی بھی بہی خواہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ملک کو جمہوریت سے محروم رکھا جائے یا ایسے نظامِ مملکت کی طرح ڈالی جائے جو جمہور کے اسلامی مزاج کے منافی ہو۔

نبوت کی حقیقت اور اس کی ضرورت و اہمیت

از جناب مولانا گوھر رحمان صاحب

نبوت و رسالت کی ضرورت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف الفاظ کے ذریعے اس کا ذکر (شرعی مفہوم کے لحاظ سے) قرآن کریم میں ۵۱۸ مقامات پر ہوا ہے۔

رسالت بصیغۂ مصدر	۹	رسالت، رسالات
رسالت بصیغۂ اسم	۳۴۶	رسول، رُسُل، مُرسَل
رسالت بصیغۂ فعل	۷۱	اَرْسَلَ، اَرْسَلْنَا، اُرْسِلَ وغیرہ
نبوت بصیغۂ مصدر	۵	النبوۃ
نبوت بصیغۂ اسم	۷۵	نبیٌّ، نبیّون، انبیاء
بعثتِ نبوت	۱۲	
	۵۱۸	

نبوت کی جو تعریف امام راغب اصفہانیؒ نے کی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے جامع اور واضح ہے۔ فرماتے ہیں:

وَالنُّبُوَّةُ سِفَارَةٌ بَيْنَ اللهِ وَبَيْنَ ذَوِي الْعُقُولِ
مِنْ عِبَادِهٖ لِإِزَاحَةِ عِلَّتِهِمْ فِي أَمْرِ مَعَادِهِمْ وَمَعَاشِهِمْ [1]

ترجمہ۔ نبوت سفارت (مستند نمائندگی) ہے اللہ اور اس کے ذی عقل بندوں کے درمیان تاکہ اُخروی اور دُنیوی اُمور میں اُن کے نقصانات اور مشکلات کا ازالہ کیا جائے۔

---

[1] مفردات القرآن - باب النون مع الیاء ص ۴۹۹ - و مثلہ فی شرح العقائد۔

اس تعریف میں نبوت کی چار خصوصیات بیان کی گئی ہیں ،

پہلی یہ کہ منصب نبوت کسب و ریاضت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ فضل خداوندی اور عطیۂ الٰہیہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنی کوشش اور قابلیت کی بنیاد پر سفیر نہیں بن سکتا ۔ جب تک کہ اسے سفیر بنانے والے نے چن نہ لیا ہو ۔

دوسری یہ کہ نبوت نمائندگی ہے ۔ نہ تو یہ الوہیت ہے ، نہ ابنیت ہے اور نہ ہی یہ کوئی فلسفیانہ علم ہے ۔ سفیر وہی ہو سکتا ہے جو بادشاہ اور آقا کا پیغام پہنچاتا ہو اور خود بھی اسی پیغام پر عمل کرتا ہو ۔ ایسا شخص اپنے آقا کا غلام ہوتا ہے ، اور اپنے آپ کو اس کا مدمقابل یا برابر نہیں سمجھتا ۔ اور فلسفہ تو عقلی باتوں کا نام ہے ۔ سفیر اور نمائندہ بادشاہ کے پیغام اور اس کی ہدایات کی تشریح تو کرتا ہے لیکن اپنی جانب سے فلسفیانہ باتیں نہیں بناتا ۔ نبی خدا کی بات کا امین ، پیغام رساں اور معلّم و شارح ہوتا ہے ۔ لیکن فلسفی من گھڑت اور خود ساختہ باتیں بناتا اور بتاتا ہے ۔ فلسفی کی بنیاد عقل بے مایہ کا ظن و تخمین ہے جو امامت و رہبری کا سزاوار نہیں ہو سکتا ؎

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں

راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات (اقبالؒ)

تیسری یہ کہ تعلیماتِ نبوت ذی عقل بندوں کے لیے ہوتی ہیں ۔ مجنون اور دیگر بے عقل مخلوق ان سے مستثنیٰ ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ ان تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے علم اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے جو بے عقل مخلوق یا کم عقل (مجنون اور نابالغ) افراد کو حاصل نہیں ہے ۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ نبوت کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی اُخروی اور دُنیوی دونوں زندگیوں کو مشکلات و مصائب سے بچایا جائے ۔ اور دونوں میں فلاح و صلاح حاصل کی جا سکے ۔ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں اور اس کے مقرر کردہ نمائندوں اور سفیروں کی تعلیمات راہبوں اور جوگیوں کی طرح ترکِ دنیا کا حکم نہیں دیتیں بلکہ حیاتِ دنیا کی اصلاح و تعمیر کا پروگرام بناتی ہیں ۔

منصبِ نبوت نفوسِ طیّبہ ہی کو مل سکتا ہے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ (القصص آیت ۶۸)

" اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کر لیتا ہے اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے ۔

اس انتخاب ۔ ان لوگوں کا کچھ اختیار نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور برتر ہے اُن سب چیزوں سے جنہیں یہ لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھیراتے ہیں ۔"

حافظ ابن القیمؒ (م ۷۵۱ھ) اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

" اللہ تعالیٰ طیّب یعنی ہر قسم کے عیب سے پاک ہے اور مخلوق کے اجناس و انواع میں سے پسند بھی طیب اور پاکیزہ چیزوں کو کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت کے منصب کے لیے اس انسان کو منتخب فرماتا ہے جو ظاہر و باطن اور صورت و سیرت دونوں کے اعتبار سے سعید اور طیب ہو ۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکیزہ کاموں کے لیے پاکیزہ لوگوں ہی کو منتخب کیا جاتا ہے ۔ اور گندے کام گندے لوگوں ہی کے ذریعے اشاعت پذیر ہوتا ہے ۔ جو خود پاک اور سعید نہ ہو وہ دوسروں کے تزکیۂ نفوس اور سعادت رُوح کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے ۔ خدا کا نبی ہر لحاظ سے پاک اور طیب ہوتا ہے ۔ اس کی رُوح بھی طیب و سعید ہوتی ہے اور جسم بھی حسین و جمیل ہوتا ہے ۔ اس کے اخلاق و اعمال پاک ہوتے ہیں ، اس کی باتیں پاکیزہ اور میٹھی ہوتی ہیں ، اس کا کھانا پینا پاک ہوتا ہے ، اس کا لباس پاکیزہ ہوتا ہے اور اس کا چلنا پھرنا ، اُٹھنا بیٹھنا سب پاک اور طیب ہوتا ہے[1]۔"

علامہ ابن خلدونؒ نبوت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" انسانوں کی ایک ایسی قسم بھی ہے جن کے اندر بشریت سے کٹ کر آسمانی فرشتوں کی جانب متوجہ ہو جانے کی استعداد و قابلیت فطرتاً موجود ہوتی ہے تاکہ وہ کبھی کبھی بالفعل فرشتہ بن جائیں ۔ خدا کے مقدس اور بلند مرتبہ فرشتے ان کو دکھائی دیں اور خدا کا کلام سُن سکیں (اور سمجھ سکیں) ۔ یہ انسان انبیاء ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے وحی کی حالت میں بشریت سے کٹ جانے کی استعداد عطا فرمائی ہے اور یہ اُن کی وہ فطرت و جبلّت ہے جس پر وہ پیدا کیے گئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بشر ہونے کے باوجود جسمانی اور بشری موانع اور رکاوٹوں سے محفوظ رکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی طبیعت و سرشت میں مضبوط قوت ارادی ، استقامت و اعتدال اور شوقِ عبادت فطرتاً موجود ہوتا ہے جس میں ان کی محنت و مشقت اور کسب و ریاضت کا کوئی دخل

---

[1] زاد المعاد ملخصاً طبع مصطفیٰ البابی مصر ۱۹۵۰ء ج ۱ ص ۲۶ - ۲۷

نہیں ہوتا" (بلکہ یہ تمام چیزیں ان کی طبیعت کا تقاضا ہوتی ہیں جن کے کرنے میں ان کو تکلیف محسوس نہیں ہوتی بلکہ نہ کرنے میں تکلیف و پریشانی ہوتی ہے[1])۔

ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری کے وہ فلسفی اور ماہر عمرانیات ہیں۔ جنہوں نے اپنے فلسفے کو آیات انبیاء کی روشنی میں مدوّن کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں نبوت کی حقیقت بہترین الفاظ اور دقیق اسلوبِ بیان میں واضح کی ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ بشری اور جسمانی رکاوٹوں کی زنجیر کو توڑ کر عالم بالا کی جانب متوجہ ہونے کی استعداد، اخلاق طیبہ اور کمالات حقیقیہ اور شوقِ عبادت ان کے اندر فطری اور جبلی طور پر موجود ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کو کارِ نبوت کے لیے پسند کرتا ہے جو ان صفات کا حامل ہو (وربک یخلق ما یشاء و یختار) ایسا نہیں ہوتا کہ جو بھی سامنے آجائے اُسے نبی بنا دیا جائے حاشا و کلا۔ جیسا کہ آیات ذیل میں فرمایا گیا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (الحج ۷۵)

(اللہ تعالیٰ (پیغام رسانی کے لیے) چن لیتا ہے فرشتوں میں سے پیغام رساں اور (انسانوں میں سے بھی) بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران ۱۷۹)

(اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر (براہ راست) مطلع کر دے لیکن وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے)

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام ۱۲۴)

(اللہ زیادہ جانتا ہے کہ اپنا پیغام کہاں اور کس پر نازل فرمائے)۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ فَخُذْ

[1] مقدمہ ابن خلدون بحث حقیقتِ نبوت ص ۸۵

مَآ اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ (الاعراف ۴۴)

(فرمایا اللہ نے اے موسیٰؑ! میں نے تم کو تمام لوگوں پر ترجیح دے کر اپنے پیغامات پہنچانے کے لیے منتخب کرلیا ہے اور اپنے سامنے ہم کلام ہونے کے لیے بھی پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجالا)

اِن آیات میں اصطفاء اور اجتباء اور جعل کے الفاظ آئے ہیں جن کا مفہوم ہے اختصاص اور انتخاب یعنی چن لینا، نامزد کرنا اور اپنا برگزیدہ و پسندیدہ بندہ بنانا۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ منصب کسبی نہیں ہے بلکہ انتخابی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ طیّب ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خود طیب ہے اور طیب غیر طیب کو کبھی پسند نہیں کرتا۔

اس اصطفاء اور انتخاب کی تشریح کرتے ہوئے امام شہرستانی (م ۵۴۸ھ) لکھتے ہیں:

"جیسا کہ اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے انبیاء کو قولاً منتخب کرتا ہے (یعنی اپنا پیغام اس پر نازل کرتا ہے) اسی طرح عملاً بھی ان کو برگزیدہ بناتا ہے کہ ان کی فطرت و سرشت میں کمال اور صفائی ہوتی ہے، ان کی طبیعت و مزاج میں شرافت، اور اخلاق و کردار میں پاکیزگی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی درجہ بدرجہ تربیت کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچتے ہیں اور اُن کی باطنی اور قلبی قوتیں کامل اور اسرار الٰہیہ (وحی) کے لیے تیار ہو جاتی ہیں تو پھر اُن کے پاس اپنے فرشتے کو بھیج دیتا ہے اور اپنی کتاب اُن پر نازل فرما دیتا ہے۔"[1]

قاضی عیاضؒ (م ۵۴۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

"محققین نے نبوت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام اخلاق حسنہ، اوصاف حمیدہ اور کمالات عالیہ جن کی اچھائی پر عقلا اور حکماء کا اتفاق ہے۔ وہ سب کے سب انبیاء علیہم السلام کو فطری اور جبلی طور پر دیے جاتے ہیں۔ یہ کمالات ان کو کسب و ریاضت اور محنت و مشقت سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ جود الٰہی (رحمت خداوندی) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے خصوصی تعلق کی وجہ سے اُن کے اندر آغازِ فطرت میں موجود ہوتے ہیں۔ جو شخص بھی انبیاء کی

---

[1] نہایۃ الاقدام ص ۴۶۳۔

سیرت کا مطالعہ آپ کے عہدِ طفولیت سے لے کر عہدِ نبوت تک کریگا اسے اس بات کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔[1]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) بارھویں صدی ہجری کے مجددین میں سے وہ امام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے احکامِ دینیہ کے حکم و اسرار اخذ کرنے کا ملکہ عطا فرمایا تھا اور جو بجا طور پر اپنے دور کے حکیم الامت کہلانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے "بابُ حَقِیْقَۃِ النّبوۃِ وخَوَاصِّھَا" اس باب میں نبوت کی حقیقت دلچسپ لیکن فلسفیانہ اسلوب میں بیان کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ انسانی طبقات میں سے سب سے اعلیٰ طبقہ ان کا ہے جنہیں فہم دیا گیا ہو۔ یہ لوگ معتدل طبیعت کے حامل ہوتے ہیں، اُن کی قوتِ ملکیہ (یعنی خیر اور بھلائی کا جذبہ) انتہائی بلند ہوتی ہے، یہ لوگ اس نظام کے قائم کرنے کی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں جو خداوند کریم کو مطلوب و محبوب ہو۔ عالمِ بالا سے ان پر علوم نازل ہوتے ہیں۔ ان کی سیرت اور مزاج میں اعتدال ہوتا ہے۔ صورت و سیرت دونوں میں تناسب و توازن ہوتا ہے۔ راہ راست کی پابندی تمام لوگوں سے زیادہ کرتے ہیں، عبادات میں اچھی عادات رکھتے ہیں لوگوں کے سامنے معاملات میں انصاف کرتے ہیں (یعنی معاشرتی انصاف قائم کرتے ہیں۔ اور عمومی تدبیر اور مفادِ عامہ کو پسند کرتے ہیں"۔

قرآن کریم میں نبوت و رسالت کا مقصد اقامتِ دین قرار دیا گیا ہے | **نبی صرف مابعد الطبیعیات کا نہیں بلکہ زندگی کے مکمل نظام کا معلم ہوتا ہے**

قرآن کریم میں نبوت و رسالت کا مقصد اقامتِ دین قرار دیا گیا ہے (الشوریٰ ۱۳)۔ ظاہر ہے کہ دین صرف مابعد الطبیعیات کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کے اس کامل نظام کا نام ہے جس میں عقائد و ایمانیات بھی شامل ہیں اور اعمال بھی شامل ہیں۔ اس نظام میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق العباد بھی ہیں۔ عبادات بھی اس کا حصہ ہے اور معاملات بھی۔ انفرادی احکام بھی اس کا جزو ہیں اور اجتماعی و تمدنی احکام و قوانین بھی۔ دین کے اسی جامع تصور سے خود بخود نبوت کا جامع تصور بھی سامنے آجاتا ہے۔ نبی ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ دنیا کی اصلاح اور تعمیر کا ہمہ گیر پروگرام لے کر آتا ہے۔

---

[1] الشفاء بتعریف حقوق مصطفیٰ باب ثانی فصل عاشرہ جلد ۱ ص ۲۰۶ طبع دمشق ۱۳۹۲ھ

لیکن نبی کی تعلیمات کی اصل غرض و غایت (نصب العین) رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہوتا ہے۔ دُنیوی مفاد کے مقابلے میں اُخروی مفاد کو اہم اور مقدم رکھنے اور دنیوی زندگی کی اصلاح کو اُخروی زندگی کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کو شرعی زبان میں زُہد کہا جاتا ہے اور ترکِ دُنیا کا نام رہبانیت ہے۔ نبی زاہد تو ہوتا ہے لیکن راہب نہیں ہوتا۔ اگر خدا کی نافرمانی کی روش اختیار کرنے یا اس روش کی تائید کرنے کے عوض اس کو دُنیا بھر کی حکومت یا سارے جہاں کے خزانے مل رہے ہوں تو وہ نہ صرف یہ کہ پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے بلکہ اس کے دل و دماغ میں انہیں حاصل کرنے کا خیال اور وسوسہ تک نہیں آتا۔ لیکن اگر یہی حکومت اور مال و دولت اُسے منشاء خداوندی اور دینِ خداوندی اور دینِ اسلام کے قیام کے لیے مل رہی ہو تو وہ خود کہہ دیتا ہے کہ اجعلنی علی خزائن الارض (مجھے زمین کے وسائل و ذرائع کے استعمال پر مقرر کرو)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے نبوت کی خصوصیات اور نبی کے اوصاف کا بہترین انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ ازالۃ الخفاء مقصد دوم اور قُرّۃ العینین دونوں میں یہ مضمون موجود ہے۔ یہاں پر قُرّۃ العینین سے اس کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"اگر تم نبی اور اس کے خواص کو جاننا چاہتے ہو تو یوں سمجھو کہ انسانی زندگی کی تعمیر کے لیے جن جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کی سب بیک وقت نبی کی ذات میں تمام دیگر انسانوں سے بڑھ کر فطرتاً موجود ہوتی ہیں۔ یعنی:

الف:۔ نبی ایک حکمران بھی ہوتا ہے جسے اِنسانِ مَدَنی کہا جاتا ہے یعنی اجتماعی اور تمدنی امور کا ماہر انسان۔ جس کی قوتِ عِلمیہ اور قوتِ عَملیہ (یعنی نظری سیاست اور عملی سیاست) کے سایے میں اہلِ قلم، صحافی، جرنیل، سیاست دان، کاشت کار، اور تاجر غرض تمام عالم اپنی اپنی زندگی کے میدان میں مناسب تربیت حاصل کرتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے کا نظام اس کے حسنِ انتظام کے دم سے قائم رہتا ہے۔

ب ۔ نبی ایک حکیم بھی ہوتا ہے جو علم اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مُدُن کے اصول کا ماہر ہوتا ہے وہ حکیم نہیں جو ان علوم و اصول کے صرف الفاظ سے آشنا ہو۔ بلکہ وہ حکیم جس کی یہ تمام صفات طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہوں حتیٰ کہ اس کی زندگی کی ہر حرکت سے یہ علوم جھلکتے نظر آ رہے ہوں۔

ج - نبی ایک مرشد کامل اور مربی بھی ہوتا ہے جو طاعات و عبادات اور اشغال و اوراد کے ان تمام طریقوں سے بخوبی آگاہ ہو جو تہذیب روح و تزکیۂ نفس کے لیے ضروری ہوتے ہیں - اور ان علوم حقہ کا ماہر اور حامل ہو جن سے انسانوں پر عالم ملک و ملکوت کے اسرار پنہاں روشن ہوتے ہیں اور اسی طرح اعمال و اذکار کے تمام خواص سے بھی آشنا ہو .... اور اس کے یہ سب کمالات فطری ہوں - کسی معلم اور درس گاہ کے رہین منت نہ ہوں[1]۔

نبوت کے ارکانِ ثلاثہ کی تشریح شاہ صاحب کے تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی نبوت کے لیے تین ارکان کا موجود ہونا ضروری ہے ، حکومت و سیاست، علم و حکمت، اور مرشد و ہدایت - ان تینوں صفات پہ عالم کی اصلاح موقوف ہے - سیاست کے ساتھ اگر حکمت نہ ہو تو اس قسم کی غیر حکیمانہ اور غیر دانشمندانہ سیاست اصلاح کی بجائے فساد کا موجب ہوتی ہے - لیکن اگر حکمت و علم تو موجود ہو مگر رشد و ہدایت اور تہذیب و تزکیۂ نفوس کا نظام موجود نہ ہو تو صرف سلطنت اور علم سے اصلاحی پروگرام کا نفاذ اور استحکام ممکن نہیں ہے - کامل تربیت کے لیے کامل مربی اور کامل اصلاح کے لیے کامل مصلح کی ضرورت ہوتی ہے - نبی کے اندر یہ تینوں اوصاف بدرجۂ کمال موجود ہوتے ہیں - وہ حکومت و سیاست کی صفات سے بھی متصف ہوتا ہے عملاً اگر اسے حکمرانی نہ بھی ملی ہو تو اصل حقیقت میں کوئی فرق لاحق نہیں ہوتا - اس لیے کہ اس اقتدار کا دار و مدار تو حالات پہ ہے مگر بایں ہمہ وہ اپنی فقیری میں بھی امیری کے اوصاف سے متصف ہوتا ہے - اسی طرح وہ علم و حکمت کا ایک بحر زخار ہوتا ہے اور تزکیۂ نفوس کے طریقے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے - ان تینوں ارکان کی مختصر سی تشریح آئندہ شمارہ میں کی جائے گی -

(باقی آئندہ)

---

[1] قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین ملخصاً - ص ۱۴۱ - ۴۲ - طبع مکتبہ سلفیہ لاہور - ۱۹۷۶ء

رسائل و مسائل

سائنس اور انجینئرنگ کی ترقی قرآن شریف کی مدد سے

سوال: مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ میرا ایمان ہے کہ قرآن شریف ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی عطا فرماتا ہے تو سائنس اور انجینئرنگ کی ترقی اور نئے نئے سائنسی راز جاننے کے لیے بھی اس میں بہت سے ایسے اشارے ملتے ہیں جس کی مدد سے یہ مسلمان اس میدان میں ترقی کر کے انسانی فلاح و بہبود اور اپنے دفاع میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ قرآن شریف سے اپنے فارغ وقت میں میں نے چند ایسے راز جاننے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ میں نے ایک ادنیٰ اسا اٹامک انرجی کا انجینئر اور سائنسدان ہونے کی حیثیت سے ان چیزوں کے معنی اپنے نقطۂ نگاہ سے اور اپنے ہی نظریہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے اس کے صحیح مفہوم سمجھنے اور وضاحت کے لیے براہ کرم ان آیات کا مطلب مجھے سمجھا دیں تاکہ میں اپنی تحقیق سائنس کے اس شعبے میں صحیح طرح سے جاری رکھ کر مسلمانوں کے لیے کوئی نئی چیز ایجاد کر سکوں۔

سورۃ	آیات
۱۔ ھود	۹۴ - ۹۵
۲۔ الحجر	۸۳ - ۸۴
۳۔ المومنون	۴۱
۴۔ یٰسٓ	۲۸ - ۲۹
۵۔ صٓ	۱۴ - ۱۵

۶ ۔ الحاقہ ۔ ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ ، ۱۳ - ۱۴ - ۱۵

۷ ۔ القارعہ ۔ ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو پھر بعد میں بتادوں گا ۔ ان آیات کی مدد سے ہم ایٹمی شعاعوں ، ایٹم کی حیثیت ، زمین کی گردش ، آواز وغیرہ کے آپس کے INTERACTION کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں ۔

جواب :۔ آپ اپنی سائنس کی تحقیق کے متعلق مجھ سے گفتگو کرنے تشریف لائے تھے لیکن اُس روز میری طبیعت اتنی خراب تھی کہ میں نے مجبوراً تفصیل کے ساتھ بات کرنے سے معذرت کر دی تھی ۔ اس کے بعد جو خط آپ میرے دفتر میں چھوڑ گئے تھے اس کو بھی میں بیماری کی وجہ سے بہت دنوں تک نہیں دیکھ سکا ۔ آج آپ کی پیش کردہ آیات کے متعلق سوالات کا بہت اختصار کے ساتھ جواب عرض کرتا ہوں :

۱ ۔ سورۂ ہود ، آیات ۹۴ - ۹۵ ۔ یہ حضرت شعیبؑ کی امت کے بارے میں ہیں ۔ حضرت شعیبؑ کی اُمت پر عذاب آنے کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک "صَیحہ" نے اُن کو آلیا اور وہ تباہ ہو گئے ۔ صیحہ عربی زبان میں زور کی آواز یا چیخ اور کڑکے کے لیے بولا جاتا ہے ۔ میں نے موقع و محل کے لحاظ سے اس کا ترجمہ " زبردست دھماکہ " کیا ہے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی سخت آواز انسانوں اور اُن کی بستیوں کے لیے تباہ کن ہوتی ہے ۔ اس کا تجربہ بھی مدت دراز سے اس دُنیا میں ہوتا رہا ہے ۔ یہی لفظ " صیحہ " قیامت کے ذکر میں بھی سورہ یٰسٓ آیت ۴۹ میں بیان ہوا ہے ۔ اور اسی کو قرآن میں لفظ " صُور " سے بھی بیان کیا گیا ہے ۔ مثلاً سورہ الزمر ، آیت ۶۸ میں آیا ہے کہ : و نفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت و من فی الارض ...... (اور اس روز صُور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ......) ۔ دونوں قسم کی آوازوں میں جو فرق قرآن مجید کے مختلف مقامات سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک زور کی آواز تو وہ ہے جو محدود پیمانے پر کسی ایک علاقے میں بلند ہو اور وہ اسی علاقے کے لوگوں کو تباہ کرے ۔ اور دوسری قسم کی زبردست آواز وہ ہے جو نہ صرف پوری زمین پر بلکہ آسمانوں تک بلند ہو گی اور تمام مخلوق کو ہلاک کر دے گی ۔ بہر حال اس سے آواز کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کان ہی نہیں پھاڑ دیتی بلکہ ہلاک کر ڈالتی ہے ۔ کبھی اس کی طاقت سے ایک قوم ہلاک ہوتی ہے اور کبھی اس کی طاقت سے قیامت برپا ہو جاتی ہے ۔ اس فرق کا انحصار

(INTENSITY OF SOUND) پہ ہے جو ہوا کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے اور اشیاء پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ قیامت کے صور کی آواز ہوا کے بجائے کسی اور عنصر کے ذریعے سے بلند ہو، کیونکہ وہ صرف زمین تک محدود نہیں ہوگی بلکہ زمین سمیت آسمانوں تک پر محیط ہوگی اور ہوا زمین کے گرد ایک محدود دائرے تک ہی پائی جاتی ہے اس کے آگے خلا میں نہیں ہے۔

۲۔ الحجر، آیت ۸۳، ۸۴ : یہ آیات قوم ثمود (اصحاب الحجر) کے بارے میں ہیں۔ اس سے پہلے اسی سورہ کی آیت ۷۳، میں بھی اس عذاب کے لیے جو قوم لوط پر آیا تھا "صیحہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت میں نے اوپر کر دی ہے۔ آیت ۷۴، میں قوم لوط کے متعلق صیحہ کا جو اثر بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی بستیاں الٹ گئیں یعنی ان کی چھتیں زمین پر آ رہیں۔ یہ آواز کی اس طاقت کو ظاہر کرتا ہے جو آدمیوں ہی کو ہلاک نہیں کرتی بلکہ معذّب قوم کی بستیوں کو بھی تلپٹ کر دیتی ہے۔ جہاں تک آیت ۸۳، ۸۴ کا تعلق ہے، میں نے خود قوم ثمود کا علاقہ دیکھا ہے۔ اس میں تمام علاقے کے پہاڑ تہ سے لے کر چوٹی تک کھیل کھیل ہو گئے ہیں۔ یہ آواز کی اس طاقت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ پہاڑوں تک کو جھنجوڑ ڈالتی ہے اور ان کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔

۳۔ سورہ المؤمنون، آیت ۴۱ : یہ بھی قوم ثمود ہی کے بارے میں ہے۔ اس میں صیحہ کی تباہی اس حد تک بیان کی گئی ہے کہ "ہم نے اس کو خس بنا کر رکھ دیا"۔ اس سے آواز کی طاقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ انسان کو صرف ہلاک ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے جسم تک کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

۴۔ سورہ یٰس، آیت ۲۸، ۲۹ : یہ ایک قوم کے متعلق ہے جس کا قرآن میں نام نہیں لیا گیا۔ وہ بھی "صیحہ" سے تباہ ہوئی اور اس کے متعلق صیحہ کی تاثیر یہ بیان کی گئی ہے کہ 'فَاِذَا ھُمْ خَامِدُوْنَ' (یکایک وہ بجھ کے رہ گئے)۔ بالفاظ دیگر ان کی شمع حیات گل ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ "خامدون" کا مطلب یہ ہو کہ ان کے جسم کی حرارت ختم ہو گئی جس سے وہ مر گئے۔

۵۔ سورہ ص، آیت ۱۴، ۱۵ : اس میں اہل مکہ کو خوف دلایا گیا ہے کہ اگر وہ نہ ماننے یا ایمان نہ لانے یا رسول اللہؐ کو جھٹلانے پر مُصر رہے تو دوسری قوموں کی طرح ان پر بھی ایک "صیحہ" آئے گا جس کے بعد پھر دوسرا صیحہ نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ہی صیحہ ان کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ دوسرے صیحہ کی نوبت نہیں آئے گی۔ مَا لَھَا مِنْ فَوَاقٍ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس صیحہ سے ان کی

تباہی میں اتنی دیر بھی نہ لگے گی جتنی دیر اونٹنی کا دودھ نچوڑتے وقت ایک دفعہ سونتتے ہوئے مٹھی میں دوبارہ سونتنے تک دودھ اُترنے میں لگتی ہے۔ یہ بات اہل عرب کو یہ بتانے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ اس آواز کی طاقت یکایک اُن کو ہلاک کر دے گی۔ اس کی نوبت نہیں آئے گی کہ کوئی شخص گر کر کچھ دیر تڑپتا رہے۔

۶۔ سورۃ الحاقہ، آیت ۱ تا ۵ اور ۱۳ تا ۱۵ = پہلی تین آیات میں قیامت کے لیے "الحاقہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا آنا بالکل برحق ہے اور وہ آکر رہے گی۔ اسی بات کو میں نے اپنے ترجمے میں "ہونی شدنی" کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ آیت نمبر ۴ میں اسی قیامت کے لیے "قارعہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرع عربی زبان میں ٹھوکنے، کوٹنے، کھڑکھڑانے اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلی کیفیت آیت ۱۳، ۱۴ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ "جب ایک ہی دفعہ صور پھونک دیا جائے گا اور زمین اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔" پھر آیت ۱۶ میں اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "صور پھونکنے کے اس فعل کی بدولت آسمان پھٹ جائے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔" بالفاظ دیگر تارے اور سیارے جن مداروں پر قائم ہیں اُن سے وہ بکھر جائیں گے اور ان کے درمیان جو جگہ (SPACE) رکھی گئی ہے وہ سب درہم برہم ہو جائے گی۔ یہ القارعہ ہی کی واضح تشریح ہے اور قرآن میں جگہ جگہ اس کی مزید تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب نفخ صور کی بدولت ہوگا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صور سے جو چیز بلند ہو گی وہ محض آواز نہیں ہو گی بلکہ کوئی ایسی طاقتور چیز ہو گی جو زمین اور پہاڑوں کو ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دے گی اور نظامِ فلکی کو درہم برہم کر ڈالے گی۔ آیت ۵ میں ثمود کی تباہی کا سبب طاغیہ بیان کیا گیا ہے جس سے مراد سخت حادثہ ہے۔ اسی حادثہ کو سورہ اعراف میں "رجفہ" کہا گیا ہے جس سے مراد زبردست زلزلہ ہے اور اسی کو سورہ ہود میں صیحہ بیان کیا گیا ہے جس کی تشریح اوپر بیان کر چکا ہوں اور سورہ حٰم السجدہ میں اس کو "صاعقۃ العذاب" (عذاب کا کڑاکا) کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود پر صرف ایک زبردست آواز ہی کا عذاب نہیں آیا تھا بلکہ ساتھ ساتھ زلزلہ بھی آیا تھا۔ پھر آیت ۶ میں قوم عاد کی تباہی کا ذکر ہے جس میں ہوا کی طاقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اس نے پوری قوم عاد کو تباہ کر دیا اور وہ کٹے ہوئے کھجور کے درختوں کی طرح گر گئے۔

۷۔ سورۃ القارعہ کے متعلق لفظ القارعہ کی تشریح میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں قیامت ہی کے لیے ٹھونکنے والی چیز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ ٹھوکائی ایسی زبردست ہو گی کہ انسان پروانوں کی طرح بکھر جائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کچھ دوسرے آثار بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق آواز یا ہوا سے نہیں ہے۔

(بقیہ اشارات) آبادیاں رہتی ہیں۔ وہ فلسطینی مہاجروں کے کیمپ ہوں، بنگلہ دیش میں بہاریوں یا غیر بنگالیوں کے کیمپ ہوں یا برما کے وطن بدر کردہ مسلمانوں کے کیمپ ہوں، ان میں رہنے والے بہ حالِ زار ہی رہ سکتے ہیں۔ کم غذا اور کم لباس کے ساتھ ان کو گذر بسر کرنی ہوگی اور شرافت اور شرم و حیا کی بہت سی روایات سے وہ محروم ہو جائیں گے۔ پھر دنیا بھر میں جو توجہ ادھر دے گی، وہ ہمیشہ باقی نہ رہے گی بلکہ اور کتنے ہی واقعات ایسے رونما ہوں گے جن کی ریڈکراس اپیل کرے گی اور اقوامِ عالم کا رُخ اُدھر کو پھر جائے گا۔ لاکھوں کی تعداد میں بے وطن لوگوں کا کوئی بھی ہجوم جسے کوئی مستقل ٹھکانہ اور ذریعہ معاش نہ ملے، کسی قارون کی خیرات پر تادیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک بڑی شرمناک کارروائی ہے جو حکومت برما نے کی ہے اور اس کے ملک بدر کردہ لاکھوں افراد کے موجودہ اور آئندہ کیمپوں کا وجود انسانیت کی توہین، اقوامِ عالم کے لیے آزمائش اور خود برما کے لیے تمغۂ ذلت ہے۔

حکومت برما کا کہنا ہے کہ ہم نے تو صرف ناجائز طور پر ملک میں آنے والے لوگوں کے متعلق کارروائی کرنے کے لیے برما کی قدیم آبادی کی رجسٹریشن کی چیکنگ کا آغاز کیا تھا جس پر چیکنگ سے بچنے کے لیے ملک میں ناجائز طور پر آنے والے مسلمانوں کی بھاری تعداد بھاگ کھڑی ہوئی۔ صفائی کے اس بیان کو سن کر ہم پوچھتے ہیں کہ اوّل تو ملک بدر کردہ مسلمانوں میں سے کئی لوگوں نے اپنی رجسٹریشن اور زمینوں اور مکانوں کی رجسٹریاں دکھائی ہیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ سب کے سب برما کے ناجائز شہری تھے۔ اس صورت میں یا تو ان کے خلاف عدالتی کارروائی کی جانی چاہیے تھی، عدالت ان کے حالات اور کاغذات کی جانچ پڑتال کرتی اور کسی کو ناجائز شہری پاتی تو اسے سزا دیتی یا ملک سے باہر چلے جانے کا حکم سناتی۔ یا پھر اگر انتظامیہ اور فوج کو خود ہی اقدام کرنا تھا تو سیدھی طرح لوگوں کو گرفتار کرکے گروہ در گروہ سرحد کے پار پہنچا دیا جاتا۔ اس میں لوگوں کو قتل کرنے اور خواتین کو بے آبرو کرنے، معصوم بچوں کی جانیں لینے، نوجوانوں کو بیگار کے لیے گرفتار کرنے اور مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں کو لوٹنے کے بعد جلانے کا جواز کیسے نکل آیا؟

خیر اب جبکہ حکومت برما مسلمانوں کے متعلق اپنا گندا اعمال نامہ سامنے لاچکی ہے، اقوام متحدہ کے ذریعے تین کام ہونے چاہییں:

ایک یہ کہ جو لوگ سرحد کے پار آچکے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی بیان لے کر ایک مجموعی رپورٹ

تیار کی جائے۔ اور یہ رپورٹ مع بیانات کے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سامنے رکھی جائے۔ ساتھ ہی حکومت برما سے یہ بات تسلیم کروائی جائے کہ وہ اقوام متحدہ کے کسی وفد کو جس میں دو ایک مسلمان ملکوں کے نمائندے بھی شریک ہوں (کیونکہ سارا قضیہ مسلمانوں کے متعلق ہے)۔ برما میں جاکر حالات کی تحقیق کریں .... یہ لوگ پبلک سے معلومات حاصل کرکے تھانوں، جیلوں اور ہسپتالوں کا معائنہ کریں کہ قریبی عرصہ میں کن مسلمانوں کو کن الزامات میں پکڑا گیا ہے اور ہوسکے تو ایسے افراد سے مل کر ان کی سرگذشتوں کے نوٹس لیں اور اندازہ لگائیں کہ انسانی حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کے چارٹر کی پامالی کس کس شکل میں ہورہی ہے۔

ان رپورٹوں کی بنا پر اقوام متحدہ کے سامنے حسب ذیل بنیادوں پر سارا کیس اٹھایا جانا چاہیے:-

۱۔ حکومت برما نسل کشی کی مجرم ہے۔

۲۔ حکومت برما حقوقِ انسانی کے بین الاقوامی چارٹر کی بہت بڑے پیمانے پر خلاف ورزی کی ہے۔

۳۔ حکومت برما نے ایک پرامن اقلیت پر کوئی متعین الزام لگائے بغیر اور عدلیہ کے سامنے معاملہ رکھے بغیر قانون نافذ کرنے والی قوتوں کو غیر قانونی طریقہ ہائے ظلم و تشدد سے کام لیا ہے۔

اس بحث کے نتیجے میں جب صورتِ حالات نتھر کر سامنے آجائے تو پھر مطالبات یہ ہونے چاہییں کہ تمام تباہ کردہ یا سلب کردہ جائیدادوں کی قیمت ادا کی جائے، قتل اور عصمت دری کے تمام واقعات پر خوں بہا اور تاوان ادا کیا جائے اور برمی مسلمانوں کو ان کی اصل جگہوں پر آباد کیا جائے۔

حکومت برما اگر ایسا نہ کرے تو اقوام متحدہ کا یہ اصولی فرض ہے کہ وہ اپنے فوجی دستوں اور ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کو وہاں لے جاکر قوت سے ضروری فیصلوں کی تعمیل کرائے۔ بغیر اس کے اس کے اعلامیوں اور بنیادی حقوق کے چارٹر کی آبرو سلامت نہیں رہ سکتی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسلامی سیکرٹریٹ نے بھی برما سے ملک بدر ہونے والے اور حکومت کی طرف سے مظالم کا نشانہ بننے والے مسلمانوں کے معاملے پر بھرپور توجہ دی ہے۔ سیکرٹریٹ کا ایک وفد بنگلہ دیش میں مہاجرین کے حالات کو سمجھنے کے لیے جاچکا ہے۔ وفد برما میں بھی جانا چاہتا ہے، تاکہ مسلمانوں کے

احوال کو بچشم خود دیکھ سکے اور افراد اور اداروں سے معلومات جمع کر سکے۔

یہ کام جلد مکمل ہونا چاہیے اور رابطہ عالم اسلامی حکومتِ برما سے مسلمانوں کے بارے میں تحفظ اور امن کی ضمانت حاصل کرے۔ اگر حکومت برما تلافی پر آمادہ نہ ہو تو اس کے بحری جہازوں کے لیے تمام مسلم ممالک کی بندرگاہیں، اس کے طیاروں کے لیے ہوائی اڈے بند کر دیے جائیں۔ اس کے اموال کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس کے غیر مسلم افراد کو کسی مسلمان ملک میں آنے یا اس کا ویزا حاصل کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ تمام تجارتی اور سفارتی تعلقات ختم کر دیے جائیں۔ مسلم ممالک کا تیل برما کو نہ براہ راست حاصل ہونا چاہیے نہ بالواسطہ طور پر۔ برما کے حق میں خبری مواد یا پروپیگنڈا مسلم ممالک کے اخباروں (یا ریڈیو اور ٹیلی وژن) میں جگہ نہ پا سکے، بلکہ غیر مسلم ممالک کے مسلم اخبارات بھی یہی پالیسی اختیار کریں۔ کسی بین الاقوامی ادارے یا کھیل کے عالمی مقابلوں میں بھی برمیوں کا وجود گوارا نہ کیا جائے۔ اقوام متحدہ یا کسی دوسرے عالمی اجتماع میں برما کا مندوب جب تقریر کرے تو تمام مسلمان مندوبین احتجاجاً واک آؤٹ کر جائیں۔

بہتر ہے کہ یہ فیصلہ جولائی میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں طے پائے، اور فی الوقت اس کے لیے مسلمان حکومتوں کے اکابر و عمائد کو تیار کیا جائے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ پورے عالم اسلام میں یوم مظلومین برما کسی مقررہ تاریخ کو منایا جائے اور اس دن تمام کاروبار بند رکھے جائیں۔

جب تک کسی ملک کی مسلم اقلیت کو نشانۂ ظلم بننے سے بچانے کے لیے ایک بار اس درجے کا اقدام نہ کیا جائے گا، بار بار دنیا کے مختلف گوشوں کی غیر مسلم حکومتیں اسی طرح مسلم کشی کرتی رہیں گی جیسے کہ وہ کرتی چلی آرہی ہیں۔

جا بجا ہمارے لاکھوں بھائی ظلم کی چکی میں پستے ہیں اور ہم چند تقریروں اور بیانوں اور قراردادوں میں اپنا رونا رو کر سمجھتے ہیں کہ اخوت اسلامی کا حق ادا ہو گیا۔

اتنی بڑی جوابی کارروائی کے لیے شاید یہ مناسب ہو گا کہ ہر مسلم ملک میں خاص کانفرنسیں منعقد ہوں جن کو قومی کانفرنس برائے انسدادِ مظالمِ حکومتِ برما" جیسا نام دیا جائے۔ درمیانی وقفے میں اگر دو دو رقوں اور چار چار ورقوں میں برما کے مظلوم مسلمانوں کے احوال شائع کر کے گھر بہ گھر جا کر چندہ جمع کیا جائے اور نقدی کے ساتھ ساتھ سامانِ غذا، پارچات، دوائیں، کمبل، خیمے وغیرہ

بھی بنگلہ دیش پہنچنے والوں کے لیے روانہ کیے جائیں تو یہ ساری سرگرمی جہاں مظلوموں کی ٹھوس مدد کا ذریعہ ہو گی، وہاں حکومت برما کے ظالمانہ اقدام کو بھی دُنیا کے بچے بچے کے سامنے آشکارا کر دے گی۔ اس سلسلے میں ہر مسلمان ملک کے اخبارات کو خاص نمبر شائع کرنے چاہئیں، ہر جگہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر جلسے ہونے چاہئیں۔ جہاں ممکن ہو وہاں حکومت برما کی ظالمانہ کارروائی کے خلاف جلوس نکلنے چاہئیں۔ برمی سفارت خانوں کے سامنے ہر مسلم ملک میں احتجاجی مظاہرہ ہونا چاہیے۔ متعدد مغربی ملکوں میں بھی یہ ہو سکتا ہے۔ ادیبوں اور صحافیوں کی انجمنوں کو اپنے دستخطوں سے احتجاج نامے شائع کرنے چاہئیں، اور مشاعروں کا انعقاد ہونا چاہیے۔

وہ دھیمی دھیمی احتجاجی آوازیں جو اس وقت ہمارے ماحول میں گونج رہی ہیں۔ یہ تو محض شرط پوری کرنے کی صورت ہے۔ احتجاج تو وہی ہوگا جو قصرِ استبداد کو ہلا دے۔ اور آئندہ کوئی ملک مسلم اقلیت کو اذیت دینے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس سلسلے میں روزنامہ دعوت دہلی کی ایک رپورٹ سے اخذ کردہ معلومات بھی پیشِ خدمت ہیں:-

۱۔ برما کے ½۱ لاکھ سے زائد مسلمان بنگلہ دیش کے سرحدی علاقے میں قائم کردہ عارضی کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۲۔ دس لاکھ سے زائد پناہ گزیں اراکان کے پیچ دار گھنے جنگلات میں چھپتے پھر رہے ہیں۔

۳۔ جنرل نے ون کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے حکومت اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی موجود ہے۔

۴۔ ۱۹۳۸ء میں وہاں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس کے نتیجے میں اراکان کے مسلمانوں نے مجاہد تحریک چلائی جو ۱۹۶۴ء میں ختم ہو گئی۔

۵۔ موجودہ قضیہ حکومت برما کے اس مطالبے سے شروع ہوا کہ مسلمانوں کو برمی رسم و رواج اختیار کرنے چاہئیں اور قومی دھارے میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مگر قومی دھارے کے

معتی بودھ رسوم ہی تھے ۔ مسلمانوں کے لیے مشکل تھی کہ وہ حکومت کی خوشنودی کے لیے اپنے تہذیبی ورثہ کو خیرباد کہہ کر برمی ازم یا بودھ رسوم کو اختیار کرلیں ۔

۶ - برمی رسوم ورواج اختیار نہ کرنے کی وجہ سے ان کے لیے عید الاضحیٰ پہ قربانی دینا ممنوع ٹھہرایا گیا ۔ اسلامی تقریبات پر سرکاری تعطیلات ختم کردی گئیں ۔ حج پہ پابندی لگادی گئی (چنانچہ اس سال برما کا کوئی بھی شخص حج کے لیے نہیں گیا) جنرل نے ون نے مسلمانوں کو اپنے نام بدلنے پر مجبور کیا ۔ مسلمان اس حکم کی تعمیل نہ کرسکے ۔ چنانچہ انہیں برمی شہریت سے محروم کردیا گیا ، اُن کے مکان چھین کر دیگر افراد میں تقسیم کر دیے گئے ۔

۷ - مسلمانوں کو برمیانے کی اس تحریک سے قبل جنرل نے ون کی حکومت مسلمانوں کو برما کا شہری سمجھتی تھی ، چنانچہ قومیتوں کی کونسل میں مسلمانوں نے اپنے نمائندے چن کر بھیجے ۔

۸ - برما کی اقتصادی زندگی پہ مسلمانوں کے اثرات بہت گراں گذرنے لگے تھے ۔ اس کا ردعمل بھی کام کر رہا ہے ۔

---

(۳)

فرد ہو ، جماعت ہو ، قوم یا تہذیب ، حکومت یا قیادت ہو ، ہر ایک کی اجل مسمٰی ہوتی ہے اور اس اجلِ مسمٰی کا تعین اعمال سے ہوتا ہے ، جیسے کہ قوموں کو مہلت کا ردیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ

حکومتوں کا معاملہ تو خاص طور پر نازک ہوتا ہے ؎

سلطنت نازک تر آمد از حباب

از دمے او را تواں کردن خراب

خصوصاً جب کوئی حکومت کسی وقتی ضرورت کے تحت اوپر ہی اوپر سے نمودار ہوئی ہو اور جس کی خود اپنی نگاہ میں بھی اس کا وجود عبوری ہو ۔ ہمارے ہاں پہلے بھی مارشل لا لگتے رہے ہیں ،

مگر اس دفعہ پہلا مارشل لا ایسا لگا ہے کہ جس نے عوام سے خراجِ محبت و تحسین وصول کیا ۔ لیکن قابلِ غور یہ امر ہے کہ آیا عوام کے جذبات اپنے اُسی معیار پہ جوں کے توں قائم ہیں ؟ زیادہ زور پہ آگئے ہیں ؟ یا پہلے سے دھیمے ہو رہے ہیں ؟ اس سوال کے جواب میں ہماری موجودہ عبوری حکومت اندازہ کرسکتی ہے کہ اس کی اجلِ مسمّٰی کتنی دُور یا قریب ہے ؟

تاریخ پڑھ کر دیکھیے ، حکومتیں اور قیادتیں اور جماعتیں اس سوال پہ اوّل تو غور ہی نہیں کیا کرتیں ، اگر کبھی اِدھر توجہ ہو بھی تو وہ خود فریبی میں مبتلا رہتی ہیں اور یہ من گھڑت رائے قائم کرکے مطمئن ہوجاتی ہیں کہ سب اچھا ہے ۔ یہ حساب لگانا کہ خود اُن کی پوزیشن میں کیا تبدیلی آچکی ہے ؟ مسائل و احوال کونسی اچھی یا بُری شکل اختیار کر رہے ہیں اور عوامی رجحانات کی جنبش کرتی ہوئی سُوئی آیا خوش آئند مثبت سمت کی طرف بڑھ رہی ہے یا ناپسندیدہ منفی جانب ۔ نتیجہ یہ کہ اجلِ مسمّٰی نوامیسِ الٰہی کے تحت یکایک تقدیر کا فرمان لیے داخل ہوتی ہے اور اس فرمان کو رد کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا ۔ جو کچھ بھی کیا جاسکتا ہے وہ اس کے صدور سے پہلے کیا جاسکتا ہے ، بعد از وقت کوئی مہلت نہیں ملا کرتی ۔

پس اصحابِ حکومت اور اربابِ قیادت کو کتنا چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے ، ورنہ ؏

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد

اب چند ایسے بدیہی اُمور کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی درست یا نادرست صورت میں واقع ہونے سے مہلتِ کار میں اضافہ یا کمی واقع ہوسکتی ہے ۔

کسی بھی حکومت کے سامنے یہ طے شدہ نقشہ موجود ہونا چاہیے کہ اُسے کتنے وقت میں کیا کیا ضروری کام لازماً انجام دینے ہیں اور کن کن خرابیوں کا کس ترتیب سے انسداد کرنا ہے ۔ یہ نقشہ ہی اگر رومانوی یا انتہا پسندانہ یا اپنے ظرفِ استطاعت سے زیادہ بڑا ہو تو منصوبہ پورا نہ ہوسکے گا ۔ اور نقشہ اگر اپنی جگہ درست ہو ، لیکن عملاً اس کے مطابق کام نہ کیا جاسکے تو صاف بات ہے کہ اقتدار کی گوہ و چوگاں میں بازی مات ہونے کا خطرہ ہے ۔ اس بنیادی اور وسیع الاثر کوتاہی کا ازالہ لوگوں

کے سامنے وضاحتیں اور معذرتیں کرنے سے نہیں ہوسکتا، کیونکہ نوامیسِ قدرت اپنا کام ریاضیاتی اور مشینی طریقے سے کرتے چلے جاتے ہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کسی بھی حکومت کو اپنے سلوگن، اپنے عقیدے اور نظریے اور اپنے اعلان کردہ پروگرام کو ملحوظ رکھ کر یہ امر بھی دوٹوک طریق سے طے کر لینا چاہیے کہ اسے اپنا کام صحیح طریق سے کرنے کے لیے کیسے لوگ چاہئیں، کن اوصاف کے افسر اور کن صلاحیتوں کے کارکن۔

آپ کو اگر مسجد کا انتظام چلانے کے لیے کوئی کمیٹی بنانی ہو تو اس میں اگر زنا و اغوا کے رسہ گیروں، اسمگلروں، سودخوروں، الحادپسندوں اور مفاد پرست منافقوں کو جمع کر دیں گے تو وہ مسجد کی آبادکاری کے بجائے اس کی تباہ کاری کا کارنامہ انجام دیں گے۔ اسی اصول پر کسی بھی درجے کی اسلامی حکومت چلانے کے لیے ایک خاص طرح کے لوگ درکار ہیں، اور ایک خاص طرح کے لوگوں کو دُور ہٹا کے رکھنا چاہیے۔ ورنہ کارکنوں میں اگر اسلام کے مخالفین اور اُن کے ساتھ اسلام ناآشنا افراد کو جمع کر لیا جائے تو نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ اُوپر سے آپ اسلام اسلام پکارتے رہیں اور نیچے اسلام کی جڑیں آپ ہی کے کارندے کھود رہے ہوں۔

یہ ضروری نہیں ہوتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی سیکرٹری ایٹ، کسی محکمے یا کسی دفتر کے سوفیصد افراد ڈھب کے ہوں۔ نہیں، ان میں سے ایک جاندار اقلیت ایسی تلاش کر کے اس کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کارپردازانہ بنا دینا چاہیے اور اسی کو افراد اور روزمرہ کام اور مصارف کا نگران بھی ہونا چاہیے جو اسلام کے لیے مخلص، پاکستان کے محب اور کردار کے لحاظ سے بے رخنہ ہو۔

یہ کام اگر نہ ہوسکے تو پھر بیوروکریسی کے بڑے افسر اور چھوٹے کارکن مل جل کر ایک ایسی آہنی دیوار بن جاتے ہیں جس کے ایک طرف حکمران قوت ہوتی ہے اور جس کے دوسری جانب عوام پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سیدھا سیدھا رابطہ باقی نہیں رہتا۔ اسی رابطے کو قائم رکھنے کے لیے سیاسی پارٹی کا ہونا ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالتی ہے اور دوسری طرف عوام سے رابطہ رکھتی ہے۔

مجھے ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ اس پہلو سے بھی حالات کا جائزہ لے کر اپنی کوئی رائے دوں۔ مفید اور مؤثر صورت یہی ہے کہ خود حکمران قوت ہی اس مسئلے پر غور کرے، حالات کو سمجھے

اور اپنی راہ عمل میں جیسی تبدیلی ضروری ہو کرے۔

کسی بھی حکومت و قیادت کی قوت کا ایک راز ان وعدوں کے صحیح اور بروقت ایفا میں مضمر ہے جو پبلک سے استوار کیے جاتے ہیں۔ ان مواعید کو اگر پورا نہ کیا جائے، یا غلط طریق سے پورا کیا جائے، یا انہیں بے جا طور پر التوا میں ڈالا جاتا رہے تو ساکھ ختم ہو جاتی ہے۔

مثلاً بحالاتِ موجودہ پبلک کے سامنے حکومت کے جو مواعید موجود ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: (۱) اُردو زبان کی بہ حیثیت قومی زبان کے ہر سطح پر اور ہر دائرے میں ترویج۔ (۲) اسلامی قوانین کا نفاذ اور عدالتوں کا یہ اختیار پا لینا کہ وہ کسی بھی سامنے آنے والے قانون کے متعلق فیصلہ کر سکیں کہ وہ اسلامی ہے یا نہیں۔ (۳) موجودہ نظام تعلیم کو بدل کر ایسا نظام تعلیم تشکیل دینا کہ جس میں مرکزیت اسلامی ایمان و اخلاق، اسلامی قانون، اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں کو حاصل ہو اور جس کا مقصد مسلم لیڈروں، مسلم انجینئرز، مسلم ڈاکٹرز، مسلم قانون دانوں، مسلم معلمین، مسلم افسران اور ملازمین، مسلم ایڈمنسٹریٹروں، مسلم ماہرین اقتصادیات، مسلم ادیبوں اور صحافیوں اور مسلم شہریوں، مزدوروں، کسانوں اور دوکانداروں کو تیار کر کے معاشرے کو بہم پہنچانا ہو۔

حکومت کی طرف سے ایک سے زائد بار دہرایا ہوا یہ وعدہ بھی سب کے سامنے ہے کہ پاکستان میں مخلوط تعلیم کو ختم کرنے کے لیے قدم اول کے طور پر دو ایک شہروں میں خواتین یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا بنگلہ دیش میں انتہا درجے کی خستہ حالی کے شکار جو غیر بنگالی تباہی کے کیمپ میں پڑے ہیں۔ ان سب کا استحقاق ہے کہ پاکستان میں انہیں پناہ حاصل ہو۔ لیکن ۲۵ ہزار افراد کو منتقل کرنے کا تو صریح وعدہ کیا جا چکا ہے۔ اس وعدے پر گذرنے والی مدت حکومت کی مقبولیت پر اثر ڈال رہی ہے۔

حکومت کی طرف سے یہ وعدہ بھی ہمارے سامنے ہے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہوا ہے کہ پیچھے دور میں قومی اتحاد کے کارکنوں کو جو سزائیں دی گئی تھیں یا ان کے خلاف جو مقدمات چلائے گئے تھے وہ کالعدم قرار دیے جائیں گے۔ بدقسمتی سے آج بھی قومی اتحاد کے کارکنوں کی ایک تعداد سزائیں بھگت رہی ہے، اور بہت سے لوگوں کے خلاف پرانے فائیلوں سے فراموش شدہ مقدمات پھر لائے جا رہے ہیں اور کئی نوجوان

پیشیاں بھگت رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ کام ایک اعلان یا فیصلے کے تحت ایک دن میں سرانجام نہیں پا سکتا ؟ کیوں نہیں پا سکتا ؟ اس میں اگر جیل یا پولیس کا عملہ رخنہ انداز ہو تو اسے انتباہ ملنا چاہیے کہ اگر ایسی کوئی سزا یا ایسا کوئی مقدمہ آج کے بعد حکومت کے نوٹس میں آیا تو متعلقہ افراد کو سزا ملے گی۔ میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ ایک کام کے کرنے کا فیصلہ ہے اور پھر وہ سرانجام نہ پا سکے۔ معاملہ مؤثر تدبیروں کے اختیار کرنے اور قطعی اقدامات کرنے کا ہے، اور بس !

بیوروکریسی کے ماہرین اور حکمران اور عوام کے درمیان حائل ہونے میں کامیاب ہو جائیں تو اصل حکومت وہ خود کرتے ہیں۔ اپنا خیال حکمران کے دماغ میں اور اپنی بات اس کے منہ میں اس طرح ڈالتے ہیں کہ اُلٹا انہیں تشکر حاصل ہوتا ہے۔ جس کے سر ذمہ داری ہے اسے حالات سے آگاہ ہی نہیں ہونے دیتے کہ وہ موافق جا رہے ہیں یا مخالف۔ دُور اندیش حکمران اس خطرے سے بچنے کے لیے ایک چیز پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ تمام کاغذات اور فائیلوں کو ان کی نظر سے گذرنا چاہیے۔ کام زیادہ ہو تو وہ اپنے اعتماد کے قریب ترین رفقاء میں سے جن کا تعلق بیوروکریسی سے نہ ہو دو ایک کا تعاون حاصل کر لیتے ہیں۔

بہت بڑی چیز جس کا خیال رکھنا لازم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کی شکایات اور تکالیف اور انہیں پیش آنے والی بے انصافیوں کا ازالہ ہو۔ اسی طرح رائے عام کو شدید طور پر متاثر کرنے والی ایک چیز جرائم کی کثرت ہے جو حالتِ امن کو ختم کر کے ہر کسی کو حالتِ خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اگر شکایات اور تکالیف کی بیلیں ہر طرف پھیل کر ایک ایک شہری کے گلے اور ہاتھوں اور پاؤں پر لپٹ جائیں اور ان میں نیچے ہی نیچے اضافہ ہوتا رہے تو کسی بھی حکومت کی مہلتِ کار میں تیزی سے کمی آنے لگتی ہے۔ اسی طرح مثبت سمت میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ باشندگانِ ملک کی تعلیمی، دینی، سوشل اور ثقافتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ٹھوس اور نمایاں اقدامات کیے جائیں۔ اور اس فلاحی و تعمیری مہم کا قدم ہر روز آگے کی طرف

بڑھتا جائے۔ اس مثبت پہلو سے بھی اگر جمود طاری ہو جائے یا انتہائی سست روی پیدا ہو جائے تو بھی اثرات اچھے نہیں ہوتے۔ حکومت —— خصوصاً انقلابی یا عبوری حکومت وہی کامیاب ہوتی ہے جو ہر صبح کو کسی نہ کسی نئے اقدام کا پیغام دے، اور ہر شام کو عوام کو کسی نئی خدمت کا تحفہ پیش کر سکے۔ معاملہ کچھ بین اور سانپ کا سا ہے۔ بین کی آواز اور سپیرے کے جھومتے سر کی جنبشیں جہاں ذرا رکیں، فوراً سانپ حملہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح حکومتیں بھی عوام کو مداریوں کی طرح ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے نئے شعبدے میں اتنا منہمک رکھتی ہیں کہ اُن کے ذہن کو حکومت کے خلاف کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

مذکورہ صورتیں اگر حسب مراد نہ جا رہی ہوں تو حکومت کے حامی عناصر جن کی تائید اُسے مسند پہ بیٹھنے کی سندِ جواز دیتی ہے، کچھ ڈھیلے ہونے لگتے ہیں۔ اوّل اوّل وہ حکمران قوت کے اقدامات کی پُرزور تائید کرتے ہیں، پھر جب حالات بہتری کی طرف نہ بڑھ سکیں تو وہ معترضین اور سائلوں کا من گھڑت توجیہات سے منہ بند کرتے ہیں، لیکن اس سے بھی معاملہ گذر جائے تو پھر وہ مخالفین کے مقابلے میں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ان کو مضبوط اور مطمئن رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ قوم کے تمام طبقات و عناصر کو اپنے ساتھ ہم آہنگ کرنا اچھا آئیڈیل تو ہے، مگر عملاً سب کو راضی رکھنے کی کوششوں سے سب راضی بھی نہیں ہوتے، اور جو مخلص حامی بھرپور تائید کرتے رہتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی حکومت کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے اصلی مخلص حامیوں کو جانے پہچانے اور ان کی تسکین کا سامان کرے اور سب کو اپنانے کی کوشش میں ان کو ہاتھوں سے گنوا نہ دے۔

بہت گہرا جذبۂ خیر خواہی ہے جس کے تحت یہ سطور لکھی گئی ہیں۔ کوئی ان کو پڑھ کر غور کرے تو بڑی بات ہے، یہ کسی کے لیے درخورِ اعتناء ہی نہ ہوں تو اپنا کوئی دعویٰ تو ہے نہیں!

اپنا مقصد دین، ملت، ملک، سیاسی کارپردازوں اور جمہور کی بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں۔

تفہیم القرآن — جلد ششم

کا

نیا ایڈیشن

عمدہ کتابت وطباعت اور جلد سازی کی جملہ خوبیوں
سے آراستہ ہو کر تیار ہے
تاجران کتب اور قارئین کرام اپنی مطلوبہ تعداد کیلیے
پہلی فرصت میں اپنے آرڈر سے ہمیں مطلع فرمائیں

ہدیہ :- ۴۲/- روپیہ

ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور